بابا فرید

بلونت سنگھ آنند

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

ہندستانی
ادب کے
معمار

ساقی ارباب ذوق

PDF BOOK COMPANY

مدد، مشاورت، تجاویز اور شکایات :

Muhammad Husnain Siyalvi
0305-6406067
Sidrah Tahir
0334-0120123
Muhammad Saqib Riyaz
0344-7227224

سرورق کے آخری صفحہ پر سنگ تراشی کے جس نمونے کی تصویر دی گئی ہے، اس میں تین جیوتشی بھگوان بُدھ کی ماتا مہارانی مایا کے خواب کی تعبیر بیان کر رہے ہیں۔ اور ان کے نیچے ایک کاتب بیٹھا ان کی تعبیر قلمبند کر رہا ہے۔ یہ شاید ہندوستان میں لکھنے کے فن کی قدیم ترین تصویری مثال ہے۔

(ناگارجن کونڈا۔ دوسری صدی عیسوی)
(بشکریہ نیشنل میوزیم، نئی دہلی)

بابا فرید

مصنف

بلونت سنگھ آنند

ترجمہ

مہرافشاں فاروقی

(آ)

ساہتیہ اکادمی

Baba Farid : Urdu translation by Mehr Afshan Farooqi of Balwant Singh Anand's monograph in English. Sahitya Akademi, New Delhi (1989), Rs. 5.

© ساہتیہ اکادمی

پہلا اڈیشن : ۱۹۸۹ء

ساہتیہ اکادمی

ہیڈ آفس :

رویندر بھون، ۳۵۔ فیروز شاہ روڈ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

سیلس آفس : سواتی، مندر مارگ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

علاقائی دفاتر :

بلاک ۷ا۔ بی، رویندر سرو ور اسٹیڈیم۔ کلکتہ ۷۰۰۰۲۹

۱۷۲، ممبئی مراٹھی گرنتھ سنگھرالیہ مارگ، دادر، بمبئی ۴۰۰۰۱۴

۲۹، ایلڈامس روڈ، تینام پیٹھ، مدراس ۶۰۰۰۱۸

قیمت : پانچ روپے

مطبع : وِمل آفسیٹ پنچشیل گارڈن نوین شاہدرہ دہلی ۱۱۰۰۳۲

فہرست ابواب

۱	تاریخی پس منظر	۷
۲	حالات زندگی اور تعلیمات	۱۸
۳	فرید مسعود یا فرید ثانی	۳۹
۴	فرید بحیثیت شاعر شریعت اسلامیہ	۴۸
۵	فرید بحیثیت شاعر طریقت	۷۳
۶	فرید ایک فنکار	۹۵

پہلا باب

تاریخی پس منظر

تصوف سارے مذہبوں کا بنیادی مرکز اور نچوڑ ہے۔ وہ انسانی روح کی اس عالم گیر خواہش سے پیدا ہوتا ہے جس کا مرکز خدا سے ذاتی رفاقت کا جذبہ ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو شدید حد تک مذہبی ہیں، مذہب بغیر تجربۂ تصوف بے معنی ہے۔ وہ لوگ مذہب کے رسمی یا تقلیدی پہلو مثلاً عبادت گزاری، روزہ، یا زیارت کے مقصد سے کیے گئے سفر وغیرہ سے مطمئن نہیں ہوتے۔ انھیں دراصل کسی اور گہرے عمیق جذبے کی تلاش ہے اور اسی لیے وہ فطری طور پر تصوف کے افکار اور تکشف کی طرف کھنچ جاتے ہیں۔ حالانکہ اور مذہبوں کی طرح اسلامی تصوف بھی مذہب کی گہرائی ہی میں جاگزیں ہے، لیکن اس کا نشوونما دیر سے ہوا اور وہ مذہب کے ان بنیادی معاملات کا حصہ نہیں تھا جو حضرت محمدؐ نے اول اسلام میں رائج کیے تھے۔ اسلامی سریت کو عام طور پر تصوّف کہتے ہیں۔ اسلام میں متصوفانہ فکر کے نشوونما اور ہندوستان میں اس کے صوفی سلسلوں کی شکل میں نمودار ہونے کے عمل کو سمجھنے کے لیے کچھ باتوں کا جاننا ضروری ہے: اسلام کے بنیادی اصول اور عقیدے، وہ ذاتی رجحانات اور صوفیات جو متصوفانہ فکر کی بنیاد ہیں، ایران میں تصوف کی بے پناہ مقبولیت خاص طور پر علماء اور شعراء میں، اور آخر میں وہ پیہم واقعات جنھوں نے اسلام کو ہندوستان تک پہنچایا اور اس مذہب کے ساتھ ساتھ مولویوں، علماء اور صوفیوں کو بھی ہندوستان سے روشناس کیا۔ اس قسم کا تفصیلی مطالعہ جس میں نہ صرف ہزار برس سے زیادہ کی، مختلف اور دور دور جگہوں کی تاریخ شامل ہوگی، کئی جلدوں میں ہی تیار ہوگا۔ لیکن مختصر خاکہ بیان کرنا ضروری ہے تاکہ اس پس منظر میں ہم صوفی شاعروں کے کلام میں صوفیانہ عناصر کو سمجھ سکیں۔

اسلام ایسا مذہب ہے جو زندگی کے ہر پہلو — روحانی، سماجی، سیاسی، معاشیاتی کو جامع ہے۔ "قرآن کا موضوع ہی انسان ہے، انسان اپنی پوری مجموعیت میں۔ قرآن میں انسانی شخصیت کے

ہر پہلو کا تصور شامل ہے۔ عقیدے، اقدار، عبادت کے طریقے، اخلاقی چال چلن کے اطوار، سماجی مراسم، نظام حکومت اور معاشیاتی سرگرمیوں کی باقاعدہ تنظیم۔" یہ محیط اور جامع نظام اسلام کے دو بنیادی عقیدوں کا نتیجہ ہے: پہلا خدا کی وحدت اور دوسرا یہ کہ خدا ہی پوری کائنات کا خالق ہے۔ کیونکہ وہ ہی واحد اور تنہا خدا ہے اس لیے وہ اعلیٰ اختیار رکھنے والا ہے اور سب مخلوق کا مالک ہے۔ اس کے بنائے ہوئے قواعد اور حکم مطلق اور کامل ہیں۔ اس کا فیصلہ آخری اور مطلق ہے۔ اسلام میں کم درجے کے (یعنی خدائے برتر سے کم) دیوی دیوتاؤں کی کوئی جگہ نہیں ہے، خدا کے فیصلے سے نہ کوئی اختلاف ممکن ہے نہ ردو بدل۔ وہی پیدا کرنے والا ہے، وہ وجود واحد ہے جو واجب الوجود ہے۔ سب کچھ اسی کا بنایا ہوا ہے اور سب اسی کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ اسلام میں نبیوں کا تصور بھی محض ان خاص انسانوں کی طرح ہے جنھیں خدا کے حکم کی فرماں برداری کرنی ہے۔ ان کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ ان کے ذریعہ خدا کا پیغام ہم تک پہنچتا ہے اور انھیں خدا کا رحم و کرم حاصل ہے۔ اس لیے ان کی عزت کرنا اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا لازمی ہے۔

خالق اور مخلوق میں جو فرق ہے اسلام اس کو پوری طرح تسلیم کرتا ہے۔ خالق اور مخلوق الگ الگ وجود رکھتے ہیں اور الگ عالم میں رہتے ہیں۔ خدا عرش پر اور انسان دنیا میں، یا پھر مرنے کے بعد جنت یا دوزخ میں۔ دونوں کے درمیان جو فاصلہ ہے وہ کسی طرح مٹ نہیں سکتا۔ کوئی محدود ہستی لا محدود (یعنی خدا) میں ضم نہیں ہو سکتی۔

اسلام دوسرے مذہبوں سے مختلف ہے کیونکہ وہ وحی اور تنزیل کے ذریعے سے ظاہر ہوا ہے۔ قرآن میں وہ سب روحانی پیام موجود ہیں جو خدا نے حضرت محمدؐ پر مختلف اوقات میں وحی کے ذریعے نازل کیے۔ جب جب وہ آیتیں نازل ہوتی تھیں انھیں حضرت محمدؐ کی ہدایت پر کاتب لکھ لیا کرتے تھے۔ قرآن دراصل خدا کا براہ راست کلام ہے اور وہ اعلیٰ ترین مقتدرہ ہے جس سے مسلمان ہدایت اور اپنے اعمال کی توجیہہ حاصل کرتے ہیں۔ قرآن کی آیتیں اخلاقی چال چلن کے طریقے، دنیاوی اور روحانی، دونوں سے آگاہ کرتی ہیں۔ قرآن میں جو مجموعۂ قوانین ہے اس کو عمل میں لانا اور دوسروں کو اس سے آگاہ کرنا، دونوں ہی ضروری ہیں۔ ان قوانین کو انسانوں کی سماجی، سیاسی زندگی کا جز بننا تھا اور ساتھ ہی ساتھ خدا کے پیغام کو پوری دنیا میں پہنچانا بھی ضروری تھا۔ لیکن ان سب باتوں سے پہلے محمدؐ کا فرض رہنما اور پیغامبر کی حیثیت سے یہ تھا کہ وہ خدا کے اتارے ہوئے پیغام کو لوگوں تک لے جائیں اور انھیں اس کے معنی اور مضمرات سمجھائیں۔ حضرت محمدؐ اپنے اس فرض منصبی کو ادا کرنے میں پوری لگن اور جوش سے مصروف

ہوئے۔ انھوں نے قرآن میں خدا کے بیان کردہ قوانین کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک نئے سماج اور نئے نظم حیات کو قائم کیا۔ وہ بے شک ایک انقلابی شخصیت تھے۔ انھوں نے عربوں کی زندگی کو بالکل بدل ڈالا اور اپنے پیغام سے انھیں وہ رہنمائی دی اور ایسا فیضان بخشا کہ ان لوگوں نے بڑے بڑے ملک فتح کر ڈالے اور اسلام کا غلبہ دور دراز ممالک تک پہنچا دیا۔

یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ مسلمان قرآن کو مذہب اسلام کا بنیادی ستون قرار دیتے ہیں۔

حضرت محمدؐ کی زندگی کے بارے میں ہماری معلومات کا مآخذ قرآن مجید میں مذکور تھوڑے بہت حوالے ہیں اور وہ روایات اور احادیث ہیں جنھیں پیغمبر کے اصحاب اور ان کے ماننے والوں نے محفوظ کر لیا تھا اور جو نسلاً بعد نسلاً ایک دوسرے تک زبانی منتقل ہوتی رہیں۔ زندگی کا وہ مثالی نمونہ اور طریقہ جس کی ہدایت ان روایات سے ملتی ہے، اسے سنت، کہا گیا۔

قرآن مجید اور احادیث دونوں مل کر اسلامی شریعت کے مآخذ کا کام کرتے ہیں۔ شریعت سے مراد وہ اصول اور قوانین ہیں جو مسلمانوں کے لیے زندگی گزارنے کا طریقہ ہیں اور ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ قرآن اور سنت انسان کی زندگی کے روحانی پہلوؤں پر ہی حاوی نہیں ہیں بلکہ اس کے سماجی بیوپار اور برتاؤ کی کلیت بھی قائم کرتے ہیں۔

چونکہ انسان سے اس بات کی توقع اور تقاضا ہے کہ وہ کامل ہو جائے، یعنی درجۂ کمال کو پہنچ جائے، اس لیے تمام مخلوقات میں انسان کا مرتبہ سب سے اعلیٰ قرار پاتا ہے۔ انسان کو قوت ارادی اور عقل عطا ہوئے ہیں۔ ان کے ذریعہ وہ علم حاصل کرتا ہے اور پھر علم کے ذریعہ لامحدود قوت تک اس کی رسائی ہوتی ہے۔ یہی عقل اس بات کو بھی ممکن بناتی ہے کہ انسان فطرت کی قوتوں کو سمجھ سکے اور انھیں اپنی منفعت کے لیے استعمال کر سکے۔ انسان کو قوت تمیز عطا ہوئی ہے۔ وہ خوب اور ناخوب میں کسی ایک کا انتخاب کر سکتا ہے اور یہی تصور اسلامی اخلاقیات کی بنیاد کا کام کرتا ہے۔ انسان کی قوتیں بالآخر اسے عیوب اور کمزوریوں سے پاکی یعنی تزکیہ حاصل کرنے میں اس کی معاون ہوتی ہیں۔ یہی تزکیہ شریعت کا انتہائی مقصود ہے۔ انسان خدا کی بارگاہ میں ذمہ دار ہے کہ خدا سے محبت کرے اس کی ربوبیت کا اقرار کرے، اس کی عبادت کرے اور پورے حلم اور انکسار کے ساتھ اس کے سامنے سر جھکائے۔

زندگی بعد موت کا اسلامی تصور سادہ اور آسان ہے۔ موت کے بعد کی زندگی رب اکبر کے

فیصلے کی قائم کردہ ہے اور یہ فیصلہ حشر کے دن سنایا جائے گا۔ موت کے بعد انسانی روح عبوری طور میں قائم رہتی ہے اور پھر بالآخر یوم جزا میں اس کی تقدیر کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اگر یہ فیصلہ اس کے حق میں ہو تو انسانی روح بہشت میں بے عیب اور اکمل زندگی کی حقدار ٹھہرتی ہے جنت میں وہ خدا سے ہم کلام اور خدا کے قریب ہوتی ہے لیکن وہ حقیقت الٰہی کا حصہ نہیں ہوتی جیساکہ فلسفۂ ویدانت کے ماننے والوں کا عقیدہ ہے۔ نروان کا تصور یعنی یہ تصور کہ محدود، لا محدود میں ضم ہو جاتا ہے اسلام کو قبول نہیں۔

اب یہاں ایک دو باتیں مذہبی زندگی کے بارے میں کہہ دی جائیں۔ یہ زندگی جس کی تنظیم قرآن مجید میں بیان کیے ہوئے قوانین کے مطابق ہوتی ہے کلمۂ لاالٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ سے شروع ہوتی ہے۔ یعنی اللہ ایک ہے اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔ مسلمانوں کی نظر میں یہی دو چیزیں ایمان کے بنیادی اصول ہیں یعنی توحید پر اعتقاد اور حضرت محمدؐ کی رسالت کا اقرار۔ ان کے علاوہ مسلمانوں کو فرشتوں اور خدا کے دوسرے پیغمبروں پر بھی اعتقاد رکھنے کا حکم ہے۔ مسلمانوں کو یہ بھی حکم ہے کہ وہ معاد یعنی حشر اور روز جزا، بہشت اور جہنم پر اعتقاد رکھیں۔ یہ ملحوظ خاطر رہے کہ یہ اعتقادات اس زندگی اور اس دنیا کے بعد کی زندگی دونوں کے لیے بے انتہا ضروری ہیں۔ اللہ پر ایمان رکھنے کے علاوہ مسلمانوں پر یہ بھی فرض ہے کہ وہ دن میں پانچ بار نماز پڑھیں، اپنی آمدنی کا ایک حصہ زکوٰۃ کے طور پر دیں، رمضان کے مہینے میں روزے رکھیں اور زندگی میں کم از کم ایک بار حج کے لیے مکہ معظمہ جائیں۔ یہ سب مناسک ضروری تو ہیں لیکن ان کی پشت پناہی اخلاقی طریقہ حیات کے ذریعہ ہونا ضروری ہے۔ یعنی ایسی زندگی جو گناہوں سے پاک ہو اور اخلاقی اصولوں کے مطابق گذاری جائے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو یہ ظاہری اعمال یعنی نماز روزہ وغیرہ خدا کی نگاہوں میں اپنی وقعت اور قیمت کھو دیتے ہیں۔

اب ہم اسلام اور سریت کے آپسی رشتہ اور ربط کا ذکر کرتے ہیں۔ اسلامی سریت یعنی تصوف نے پہلے پہل اپنا اظہار ریاضت اور نفس کشی کے ذریعہ کیا۔ سب سے اولین صوفی بہت بڑے تپسوی بھی تھے۔ پیغمبرؐ کی زندگی میں ہی ان کے بعض اصحاب دنیا کو حقیر سمجھتے تھے اور عیش و آرام سے عاری زندگی بسر کرتے تھے۔ دنیاوی لذات کو ترک کر کے ان لوگوں نے بالارادہ غریبی اور مفلسی کی زندگی کو اختیار کیا۔ ترک لذات اور نفس کشی کو صوفی زندگی کے بنیادی عنصر کی حیثیت سے قبول کر لیا گیا۔ قرون اولیٰ کے یہ صوفی توبہ اور توکل پر بہت زور دیتے تھے ان کے تصورات خدا کے ماورائی تصور سے فیضیاب تھے۔

دوسری صدی ہجری کے آتے آتے تصوف توحید پر مبنی ایک فلسفہ، دین بن گیا جس میں خوف خدا اور روز حشر کے تصورات سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ لیکن یہ تیسوی صوفی خدا کی محبت بھری عبادت پر بھی پورا زور دیتے رہے تھے۔ عشق الٰہی کا یہ تصور حضرت رابعہ (وفات ۱۸۵/۸۰۱) کے ایک قول میں بہترین طریقے سے ادا ہوا ہے۔ انھوں نے فرمایا " اللہ کی محبت نے مجھے اس طرح جذب کرلیا ہے کہ اب میرے دل میں نہ محبت ہے نہ نفرت اور نہ ہی کوئی اور چیز"۔ عشق الٰہی کا اصول حضرت رابعہ کے نام سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منسوب ہوگیا ہے۔ اپنے اشعار میں وہ انسانی عشق کی علامتی زبان کے ذریعہ صوفی اور اس کے معشوق حقیقی کے درمیان گزرنے والے معاملات بیان کرتی تھیں۔ ان کا یہ طریقہ اور طرز بعد کی صدیوں میں عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں بہت مقبول ہوا۔

یہاں پر یہ بھی بات قابل ذکر ہے کہ اسلامی قواعد اور قوانین کے ذریعہ لگائی گئی روک ٹوک کے باوجود بہت سے آزاد طبع لوگوں نے سچ کو تلاش کرنے کی انفرادی کوشش کی اور خدا سے ذاتی رفاقت حاصل کرنے کی امید ہمیشہ رکھی۔ انھوں نے روحانی تنویر حاصل کرنے کے لیے متصوفانہ فکر کا سہارا لیا۔ انھیں قرآن مجید اور حدیث کی رسمی، سطحی یا کتابی تعلیم جس میں روزہ، نماز اور حج پر زور دیا جاتا ہے ناقابل تسکین لگتی تھی۔ لیکن ہمیں ایک بات صاف صاف سمجھ لینی چاہیے۔ صوفیوں نے رسمی یا تقلیدی مذہب کو رد نہیں کیا اور نہ ہی اس سے رشتہ توڑا۔ وہ نمایاں طور پر مذہبی لوگ تھے۔ بات صرف یہ ہے کہ وہ مذہب کے روایتی اور خشک اخلاقیاتی طرز عمل سے مطمئن نہیں تھے وہ مابعدالطبیعاتی اور ورارفطری تجربات کے مشتاق تھے۔ انھوں نے روحانی اطاعت اور دل ودماغ کی پاکیزگی کو زیادہ اہم سمجھا اور باصرار کہا کہ علماء کے بنائے ہوئے قوانین اور اخلاقی اصولوں کے ذریعہ خدا کے نزدیک آنے یا ذاتی رابطہ قائم کرنے میں مدد نہیں مل سکتی۔ وہ انسانی وجود کے مختلف زاویوں کا گہرائی سے مطالعہ کرنا چاہتے تھے اور یہ مطالعہ تبھی ممکن ہو سکتا ہے جب کہ پانچوں حواس مسدود ہوں۔۔ یہی باطن کی دنیا تھی، وہ روحانی دنیا جو انھیں ظاہری عام دنیا کی بہ نسبت کہیں زیادہ اطمینان بخش اور زندگی بخش لگتی تھی۔ یہ روحانی دنیا لامحدود کے علم پر مشتمل ہے چاہے اس علم کو اس طرح بیان کیا جائے کہ یہ محدود کا لامحدود میں ضم ہوجانا ہے یا اس طرح کہا جائے کہ یہ حقیقت آخری کے دو بدو ہونے کا احساس ہے۔ یہ دراصل مسرت ابدی ہے اور انسان کی اس کائناتی تمنا کی تکمیل ہے کہ وہ وجود الٰہی میں خود کو گم کردے اور یہی تلاش روحانی کی آخری منزل ہے اس کے بعد ان حد اور ہمہ جہت اور ہمہ وقت کے سوا کچھ نہیں۔

اس تذکرے کو آگے بڑھانے سے پہلے یہ واضح کردینا مناسب ہوگا کہ لفظ 'صوفی' عربی لفظ 'صوف' بمعنی 'اون' سے ماخوذ ہے۔ عرب اور ایران میں درویش عام لوگوں کی طرح ریشمی یا سوتی کپڑے نہ پہن کر اونی کپڑے پہنا کرتے تھے۔ بابا فرید نے اپنے ایک اشلوک میں اپنا تعارف 'کملی' یعنی اونی چادر میں لپٹے ہوئے درویش کی صورت میں کیا ہے۔ کچھ ادیبوں کا خیال ہے کہ لفظ 'صوفی' یونانی Sophos، بمعنی 'معرفت' یا 'روحانی علم' سے ماخوذ ہے۔ اس نظریہ کے مطابق صوفی وہ ہے جس نے علم روحانی حاصل کرلیا ہے یا جو روحانی علم کے ذریعے وجود اعلیٰ تک پہنچنا چاہتا ہے۔ صوفی کا ایک مطلب 'پاک' بھی ہے یعنی صوفی وہ ہے جس نے دل کی پاکیزگی حاصل کرلی ہو۔ ان سب تشریحوں میں سب سے قابل قبول پہلی والی تشریح ہے' یعنی صوفی اونی کپڑے پہننے والا وہ درویش ہے جس نے اپنے آپ کو دنیا سے الگ کرلیا ہے اور خلوت میں زندگی گزار کر خدا کی رفاقت حاصل کرنے کا خواہاں ہے۔

صوفیوں کو روحانیت میں اعتقاد کا فیضان خود قرآن مجید سے ملا۔ اس کے علاوہ جو مختلف تجربات حضرت محمدؐ نے بیان کیے ان سے بھی صوفیوں نے فیضان حاصل کیا۔ حالانکہ پیغمبرؐ نے بنیادی طور پر شریعت پر زور دیا لیکن قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس میں ایسی آیتیں بھی ہیں جو طریقت اور حقیقت کے تصورات سے متعلق ہیں۔ قرآن مجید کی بہت سی آیتیں ایسی ہیں جو خدائے قادر اور توانا کے نامفہوم اور ناقابل تجزیہ طرز عمل کے بارے میں بتاتی ہیں اور ان اسرار کا ذکر کرتی ہیں جو اس کی قوت کے پس پشت پنہاں ہیں اور کائنات پر اس کے حکم کی گرفت کا ذکر کرتی ہیں جو کون ومکاں کے باقاعدہ اور منظم تفاعل کو انجام دیتا ہے۔ ایک طرف تو اس کی صفت رحیمی اور رحمانی ہے جس کی بنا پر وہ اپنے ہر بندے سے محبت کرتا ہے اور اس بات کو ممکن بناتا ہے کہ بندہ اپنی ذاتی حیثیت میں براہ راست اس کے پاس پہنچنے کی سعی کرسکے۔ پھر اس کی وہ صفات ہیں جو قرآن مجید میں مذکور ہیں جو خدائے قادر وتوانا کے ساتھ براہ راست رابطہ قائم کرنے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر حضرت محمدؐ پر نزول وحی کی حقیقت تھی جس کی بنا پر صوفیوں کا یہ اعتقاد تھا کہ اللہ تعالیٰ تک براہ راست پہنچنا ممکن ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر سے کلام کیا تھا اس لیے یقیناً وہ ان سے بھی کلام کرے گا جو پیغمبر کے نقش قدم پر چلتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کو اپنے اعمال کے ذریعہ راضی کرتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ صوفیہ نے معراج پیغمبرؐ کو بہت اہم قرار دیا۔ معراج کا واقعہ احادیث

میں بہت تفصیل سے مذکور ہے۔ پیغمبرؐ کو معراج کی رات میں اک آسمانی سواری جس کا نام براق تھا ساتویں آسمان پر لے گئی تھی اور وہاں پیغمبرؐ اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہوئے تھے۔ کچھ احادیث میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ پیغمبرؐ نے ایک پوری رات لقائے ربانی میں گزاری اور خدا نے ان کو یہ حکم دیا کہ وہ دنیا میں واپس جاکر خدا کی شریعت کو قائم کریں۔ قرآن کے مطابق اور بھی کئی مواقع پر اللہ تعالیٰ نے حضرت محمدؐ سے براہ راست کلام کیا۔

پیغمبرؐ کا اللہ تعالیٰ سے یہ براہ راست، اور قریبی بلکہ اقرب تعلق، فطری طور پر صوفیہ کے لیے ایک روحانی فیضان ثابت ہوا اور اس کے ذریعہ اسلامی سریت کی راہ استوار ہوئی۔

اسلامی سریت اپنی تاریخ کے اوائل میں یونانی فکر سے بھی متاثر ہوئی۔ نوافلاطونیت کے دو سب سے اہم تصورات تھے (۱) حقیقت کا وجود ہر جگہ ہے اور (۲) عشق ہی وہ قوت ہے جس کے جس کے ذریعہ جز اور کل میں روحانی امتزاج پیدا ہو سکتا ہے۔ اول الذکر وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا نظریہ ہے۔ وحدت الوجود یعنی تمام وجود صرف ایک ہے۔ اور وحدت الشہود یعنی کائنات میں الوہیت کا ظہور۔ خدا چونکہ ہر جگہ ہے اس لیے وہ انسان کے اندر بھی موجود ہے۔ تصوف کی بلند ترین منزل یہی تھی کہ خدا کو ہر جگہ حاضر اور ہر چیز میں موجود دیکھا جائے (ہمہ اوست)۔ عظیم صوفی شعرا فریدالدین عطار اور جلال الدین رومی نے اپنے کلام میں ان تصورات کا اظہار کیا۔

تصوف کی تاریخ میں ایک بہت اہم ہستی تھے حضرت بایزید بسطامی۔ انھوں نے وجدانیت کے عنصر کو فلسفہ تصوف میں داخل کرکے اسے ایک نیا موڑ دیا۔ فارسی کے صوفی شعرا نے عشق کے نوافلاطونی نظریہ کو ایک روحانی قوت تسلیم کیا۔ اس نظریہ کو ماننے کی وجہ سے اعلیٰ درجے کے شعری تصانیف تخلیق ہوتے۔ لیکن حضرت بایزید نے اس محبت بھری عبادت کو ایک جذباتی اور مجازی موڑ دیا۔ اب عشق نے جستجو اور معشوق میں جذب ہونے کی صورت اختیار کرلی۔ انسانی محبت کے تصور کو رابعہ بصری کی علامتی زبان نے جذباتی شدت بخشی، نتیجہ کے طور پر ایسی وجدانیت پیدا ہوئی جس میں عاشق اور معشوق کا ایک ہو جانا ایک کا دوسرے میں ضم ہو جانا تھا۔ جذبہ عشق کو ترفیع دے کر عبادت کے درجے تک پہنچا دیا اور سکر اور وجد کو مراقبہ تک۔ عشق میں وجد کی اس منزل تک پہنچنے کے لیے صوفیوں نے اجتماعی حال و سماع کو فعل عبادت میں داخل کیا۔ عشق کا ہر پہلو سامنے پیش کیا، عاشق و معشوق کا ملنا اور بچھڑنا، ان کے آنسو اور آہ، وجد اور کرب، معشوق سے ملنے کی خواہش جو کبھی ختم نہیں ہوتی، آرزو اور اس کی تکمیل، معشوق کے سراپا کا مجازی بیان

تشبیہ اور استعارے کے ساتھ۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان سب باتوں کی تشریح عشق حقیقی کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ اس طرح عشق کو روحانیت کی اونچائیوں تک ترفیع دی جاتی ہے اور خدا سے یکتا ہونے کا وہ واحد ذریعہ بن جاتا ہے۔

راسخ العقیدہ مسلمانوں نے ان دونوں طریق کار پر، جن کے ماننے والے حضرت بایزید کی طرح وحدت الوجود اور وحدالشہود کے بھگت ہو جاتے ہیں اور خدا کو ہر شے میں دیکھتے ہیں، اعتراض کیا۔ حضرت بایزید کا قول ہے کہ "میرے لبادے کے نیچے کچھ نہیں ہے سوائے خدا کے۔ سبحانی ما اعظم شانی" حضرت بایزید کو شہر بدر کر دیا گیا۔ لیکن ان کے اس طرز فکر کو حسین ابن منصور الحلاج نے آگے بڑھایا۔ ان کا اسراری فارمولا 'انا الحق' (میں حق ہوں) ہندوستان اور فارس میں سریت کے نشوونما میں ایک اہم عنصر تھا۔ حضرت حلاج نے خدا کی ماورائیت کے تصور کو مستحکم کیا۔ حضرت حلاج کا خیال تھا کہ یہ اللہ کی محبت تھی جو مختلف صفات الہٰی کی شکل میں ظاہر ہوتی تھی۔ "انسان کامل" کے بارے میں ان کے فلسفہ کی بنیاد یہی تھی۔ بیسویں صدی میں علامہ اقبال نے اسی نظریہ فکر کو دوبارہ زندہ کیا۔ مگر اسی عقیدہ کی بنا پر حضرت حلاج کو لوگوں نے قصوروار ٹھہرایا اور خلیفہ المقتدر کے عہد میں وہ شہید کر دیئے گئے۔

قدامت پسند مسلمانوں نے صوفیہ کی انفرادی اور اجتماعی حال و سماع کی محفلوں پر اور روحانیت میں جذباتیت اور وجدانیت کے اشتراک پر بھی سخت اعتراض کیا۔

یہ بات فطری ہے کہ ایک مخصوص صوفی فکر و طرز حیات ان سب پیچیدگیوں کے درمیان ابھرا۔ تصوف کی جڑیں شریعت میں گہرائی سے پنہاں تھیں۔ صوفیاء کرام کا دلی عقیدہ تھا کہ شریعت ہی طریقیت کی راہ دکھاتی ہے اور طریقت معرفت کی۔ چونکہ شریعت کے سہارے کے بغیر حقیقت اخریٰ کا حصول یا اس سے اتحاد ناممکن ہے اور منزل آخری کے شعور کے بغیر شریعت محض عمل اور بے معنی ہے، لہٰذا روزے، نماز اور حج کی تبلیغ کرنے کے ساتھ ساتھ صوفی طرز حیات کا آغاز توبہ سے ہوتا ہے۔ یعنی صوفی گناہ آلودہ زندگی ترک کر کے خود کو خدا کی بندگی کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ صوفی نے خدا سے لو لگانے کی خاطر اپنے کو دنیاوی جدوجہد سے علیحدہ کر لیا اور عزلت کی زندگی گزارنا پسند کیا۔ اس کی زندگی خشیت الہٰی کے سائے میں گزری۔ یہ احساس اسے پاکیزہ زندگی گزارنے اور اپنے مقصد کو زیادہ

مستحکم ارادہ سے حاصل کرنے میں مدد کرتا ہے۔ خدا پر اعتقاد یعنی توکل کے باعث وہ آسودگی کی زندگی گزارتا تھا اور خدائے کریم پر پورا بھروسہ رکھتا تھا کہ وہ زندگی کی احتیاج پوری کرے گا۔ وہ اکثر خاموش رہتا کیونکہ خاموشی ارتکاز اور دھیان میں مدد کرتی ہے۔ صوفی کو یہ احساس تھا کہ وہ خدا کا غلام ہے، اسے خدا میں پورا یقین تھا اور وہ اس سے فضل کا پورا شکر گزار تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ اخلاقی زندگی یعنی "خلق" روحانی زندگی کی بنیاد ہے۔ اور صوفی کا یقین مطلق تھا کہ نجات خدا سے سچے اور گہرے عشق، تپسیا، دھیان اور معرفت یعنی علم روحانی سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ یہی وہ زندگی کاملی تھی جسے صوفیا کرام حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔

ساتویں صدی میں فارس اسلامی دنیا کا ایک جز بن گیا۔ دو تہذیبوں کا انضمام، ایک طرف عربی اسلامی تہذیب اور دوسری طرف ایران کی عجمی۔ آریائی تہذیب نتیجہ ہوا تصوف کی حیرت انگیز مقبولیت۔ یہاں تصوف کو ایسی سرزمین ملی جس میں اسے پھلنے پھولنے کا پورا موقع ملا۔ صوفیت نے اعلیٰ اخلاقیات نازک مابعدالطبیعات اور سب سے بڑھ کر ادب کو بہت کچھ دیا۔ ایسا لگتا تھا گویا ایرانی ادب کی قوت تخیل کو صوفی طرز تصور نے جکڑ لیا تھا، اور پھر ان کے خلقی، جمالیاتی اور تخیلاتی اختراعی صلاحیت نے اعلیٰ اور فصیح فارسی شاعری کو جنم دیا۔ کلاسکی فارسی شاعری میں نہ صرف بڑی حد تک صوفی طرز فکر کا عنصر شامل ہے بلکہ وہ اپنے سرچشموں کے اعتبار سے بھی صوفیانہ ہے۔

نویں اور دسویں صدی میں عربی اور فارسی زبانوں میں تصوف پر بہت سی عالمانہ کتابیں لکھی گئیں۔ اس کے علاوہ ایران اور افغانستان میں فارسی ادب کے ذریعہ تصوف کو مقبولیت عام حاصل ہوئی۔ نتیجہ کے طور پر گیارہویں صدی کے آتے آتے صوفیوں کے مختلف سلسلے قائم ہوئے۔ تصوف کے جن مختلف تصورات یا نظریوں کو وہ اہمیت دیتے تھے ان سے ان کی انفرادیت کی شناخت ہوتی تھی۔ ان سلسلوں نے ایران اور افغانستان میں سریت کی تحریک کو منظم کرنے اور ایک دوسرے سے رشتہ جوڑنے میں مدد کی۔ اس کے علاوہ سری تصورات کو معین کرنے اور خانقاہوں اور جماعت خانوں میں طرز زندگی کے بنیادی اصول قائم کرنے کی ذمہ داری بھی انھوں نے سنبھالی۔ اس طرح صوفیوں کے کئی مستقل سلسلے قائم ہو گئے۔ ان میں سب سے نمایاں تھے چشتی، سہروردی، نقشبندی اور قادری۔ چشتی سلسلے کا نام افغانستان میں ہرات کے پاس چشت نام کے ایک گاؤں پر رکھا گیا۔ اسی گاؤں میں بارہویں صدی میں اس سلسلے کے بانی حضرت خواجہ ابو اسحاق

رہا کرتے تھے۔ اس سلسلے کی ابتدائی تاریخ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہے مگر ہمیں یہ معلوم ہے کہ ہندوستان تک اسے پہنچانے کا شرف حضرت خواجہ معین الدین حسن سجزی کو حاصل ہوا۔ وہ پرتھوی راج کی حکومت کے زمانے میں ہندوستان آئے اور انھوں نے اپنی خانقاہ کے لیے اجمیر کو چنا۔ چشتیہ سلسلے کے دو اور مرکز قائم ہوئے۔ دلّی میں حضرت بختیار کاکیؒ نے اور ناگوڑ میں حضرت حمید الدینؒ نے یہ مرکز قائم کیے۔ حضرت فرید الدین گنج شکر حضرت بختیار کاکیؒ کے مرید تھے۔ وہ سادہ اور مرتاض طرزِ حیات کے قائل تھے۔ اور ان کی قائم کردہ اجودھن کی خانقاہ میں بھی طرزِ زندگی رائج تھا۔ اس سلسلے کے سب سے ممتاز صوفی تھے حضرت نظام الدین اولیاؒ اپنے عہد کے مسلم سماج پر ان کا زبردست تقدسی دباؤ تھا اور لوگوں کے دلوں میں ان کی بے پناہ عزت تھی۔ ان کی خانقاہ دلّی میں ہے اور آج بھی ان کے مزار پر ہزاروں لوگ دعا مانگنے اور سکونِ قلب کی تلاش میں آتے ہیں۔

سہروردی سلسلے کے بانی شیخ ابو نجیب عبدالقادر سہروردی تھے۔ لیکن بغداد میں اس کی نشو ونما کے ذمہ دار تھے ان کے بھتیجے حضرت شہاب الدین سہروردی۔ ایران اور عراق میں بدامنی کے باعث ان کے بہت سارے مریدوں نے ہندوستان ہجرت کی۔ ان میں سے ایک یعنی حضرت بہاؤ الدین زکریا نے تیرہویں صدی میں ہندوستان میں اس سلسلے کو قائم کیا۔ انھوں نے ملتان کو اس سلسلے کا مرکز قرار دیا۔ انھوں نے سلطان التمش کے ساتھ اچھے مراسم قائم کیے اور ان کی خانقاہ دولت اور تونگری کے لیے مشہور تھی۔

نقش بندی سلسلہ دراصل ایک قدیم تر سلسلے کی شاخ تھا جسے سلسلۂ خواجگان کہتے ہیں۔ اس کے بانی وسط ایشیا کے مشہور مذہبی رہنما خواجہ احمد تھے۔ عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ انھوں نے ترکوں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ ترکستان میں تصوف کو مقبولیت انھیں کی ذات سے حاصل ہوئی۔ ہندوستان میں نقش بندیوں کو مغل بادشاہ اکبر کے عہد میں حضرت خواجہ باقی باللہ نے قائم کیا۔

قادری سلسلے کی بنیاد عراق میں شیخ عبدالقادر جیلانی نے بارہویں صدی میں ڈالی۔ وہ اپنے وقت کے سربرآوردہ صوفی، ولی اللہ اور مصلح تھے۔ قادری سلسلے کو ہندوستان میں حضرت غوث نے رائج کیا۔ ۱۴۸۲ میں اچھ میں انھوں نے اپنی خانقاہ بنائی۔ سترھویں صدی میں اس کی اہمیت اور نمایاں ہوئی۔ اس وقت کے سلسلے کے سربراہ حضرت محمد میاں میر تھے جو کہ شہزادہ دارا شکوہ

اور شہزادی جہاں آرا رکے بھی پیر تھے۔ ہندوستان کے دور جدید میں یہ سلسلہ سب سے زیادہ مقبول عام ہے۔

ہندوستان میں تصوف کے وقوع کا بہت گہرا تعلق ان تاریخی واقعات سے ہے جن کی وجہ اسلام اس ملک میں آیا۔ ۹۹۸ میں تخت نشین ہونے کے بعد ہندوستان پر محمود غزنوی نے بہتیرے حملے کیے۔ ان حملوں نے ہندوستان کی تاریخ کو بدل ڈالا۔ محمود نے گویا راہ ہندوستان کھول دی اور ہندوستانی ریاستوں کے آپسی اختلافات اور دیگر کمزوریوں کو عیاں کر دیا۔ اس طرح اس نے ہندوستان میں ترکوں کی حکومت قائم ہونے میں مدد کی اور آئندہ کی دہلی سلطنت کا راستہ بھی ہموار کیا۔ بالآخر وہ سلطان محمد غوری تھا جس نے ۱۱۸۶ میں لاہور اور ملتان کو فتح کیا اور شمالی ہندوستان میں مسلم غلبہ کی بنیاد ڈالی، اور پنجاب میں غزنوی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ ان کی حکومت میں لاہور ان کا ثانوی دارالسلطنت بن گیا اور "غزنہ کوچک" نام سے مشہور ہو گیا۔ لاہور میں اعلیٰ طبقے کے مسلمانوں کی زبان فارسی بن گئی۔ جب غزنی کو سلطان علاء الدین جہاں سوز نے لوٹ کر جلا ڈالا تب لاہور غزنوی حکومت کا اہم دانش ورانہ مرکز بن گیا۔ بعد میں اس کی اہمیت اور بھی زیادہ بڑھ گئی جب سلطان خسرو ملک نے اسے ملک کا دارالسلطنت بنا دیا۔ لازمی طور پر لاہور کی کشش شاعروں اور ادیبوں کو افغانستان سے کھینچ لائی۔ یہ ادیب اور شاعر شاہی دربار سے منسلک ہو گئے۔ ۱۱۹۳ میں دربار کے لاہور سے دلّی منتقل ہونے پر دلّی برصغیر میں فارسی شاعری کا مرکز بن گیا۔ اور ہندوستان میں مغل حکومت کے ختم ہونے تک یہ خصوصیت دلّی ہی کو حاصل رہی۔

گیارہویں صدی کے اواخر میں وسط ایشیا میں مغلوں کا عروج شروع ہوا۔ جو مختلف خم و پیچ اس زمانے میں نمودار ہوئے ان کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مہاجرین کی کثیر تعداد ہندوستان چلی آئی۔ ۱۲۱۴ میں متحدہ مغل قبیلوں کے سردار چنگیز خاں نے بیکنگ کو فتح کیا اور پھر مغرب کی طرف مڑ کر بجلی کی سی سرعت سے ترکستان، ایران، آرمینیا اور شمالی ہندوستان لاہور تک فتح کر لیا۔ مغلوں نے عجم اور وسط ایشیا میں اسلامی حکومتوں کو ختم کر دیا، عوام کے جان و مال کو نقصان پہنچایا اور شدید تباہی پھیلائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حملہ آوروں کے ظلم سے بچنے کے لیے اور پناہ کی امید دلوں میں لیے مہاجرین مسلسل قطاروں میں اپنا گھر بار چھوڑ کر ہندوستان کی طرف چلے۔ شہر دلّی نے قطب تارے کی مانند عالم و فاضل شخصیتوں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ دلّی کا رخ کرنے والے ممتاز علماء میں شیخ ابوالحسن الہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، شیخ جلال الدین تبریزی، سید جلال الدین بخاری اور حضرت

قطب الدین بختیار کاکیؒ جیسی اہم شخصیتیں بھی شامل تھیں۔ ان میں زیادہ تر صوفیوں نے اپنی قائم کردہ خانقاہوں میں اپنے مخصوص اسراری طرزِ فکر و فلسفہ کی تعلیم دینا شروع کیا۔

یہاں پر یہ بتانا ضروری ہے کہ ہندوستان کو ہجرت کرنے کا عمل ایران پر چنگیز خاں کے حملے سے پہلے شروع ہو چکا تھا۔ خورستان کے مختلف قبیلوں میں نا مختتم آپسی جنگیں چل رہی تھیں۔ مثال کے طور پر ۱۱۵۳ میں غز قبیلے کے ترکوں نے سلطان سنجر کی مخالفت کی اور خورستان اور دوسرے کئی صوبوں کو تباہ کر ڈالا۔ انھوں نے غزنیں فتح کر لیا اور شاہ کو ہندوستان میں پناہ لینی پڑی۔ غزنیں اور کابل میں مسلسل جنگ اور وسط ایشیا سے بار بار حملے کے خطرے نے بہتوں کو ہندوستان کی زرخیز سرزمین میں جہاں ترک اپنی حکومت قائم کر رہے تھے قسمت آزمائی کے لیے مجبور کیا۔ کابل سے آنے والے مہاجرین میں ایک عالم قاضی شعیب تھے، جو کہ نہ صرف عالم تھے بلکہ بڑے مذہبی بزرگ بھی تھے۔ اپنے تین بیٹوں کے ہمراہ قاضی شعیب لگ بھگ ۱۱۵۷ میں لاہور پہنچے۔ قاضی شعیب حضرت فرید مسعود کے دادا تھے۔ فرید مسعود ۱۱۷۳ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت قاضی شعیب کو ہندوستان آئے سولہ برس ہو چکے تھے۔

دوسرا باب

حالات زندگی اور تعلیمات

قاضی شعیب کے خاندان کے بارے میں ہمیں کوئی خاص معلومات حاصل نہیں ہیں۔ "سیر الاولیاء" کے مطابق قاضی شعیب کابل کے فرمانروا خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ خاندان فرخ شاہ کے عہد میں اپنے مکمل عروج پر تھا۔ لیکن جب فرخ شاہ نے اپنا ملک گنوا دیا اور غزنوی حکومت کا دور دورہ ہوا تو اس خاندان کا مرتبہ، سطوت و شوکت بھی چھن گیا۔ تاریخ میں کہیں بھی فرخ شاہ کا ذکر بحیثیت بادشاہ کابل نہیں ملتا۔ اس لیے یہ ممکن ہے کہ یہ پورا واقعہ محض ایک روایت ہو جو ان کے مریدوں نے بیان کی ہو۔ ایک اور مصنف نے قاضی شعیب کا شجرۂ نسب خلیفہ امیرالمومنین حضرت عمر فاروق رضؓ سے ملایا ہے۔ سچائی چاہے کچھ بھی ہو کم از کم یہ تو پورے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ قاضی شعیب کسی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے، انھوں نے قرآن مجید اور حدیث کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور افغانستان چھوڑنے سے قبل وہاں کسی اونچے عہدے پر ضرور متعین تھے۔

شعیب نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ انھیں درباری زندگی کی دھوم دھام اور لاہور کی چہل پہل سے زیادہ دینیات کے مطالعہ میں دل چسپی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد وہ لاہور چھوڑ کر قصور چلے گئے۔ قصور کے قاضی کو شعیب کے خاندانی حالات سے اچھی واقفیت تھی۔ انھوں نے سلطان کو یہ خبر پہنچائی کہ ایک اعلیٰ خاندان کا ممتاز عالم ان کے شہر آگیا ہے۔ سلطان نے انھیں کسی اونچے عہدے پر مقرر کرنے کی خواہش ظاہر کی لیکن شعیب نے اس درخواست کو نرمی سے یہ کہہ کر نا منظور کر دیا کہ درباری زندگی اور اونچے عہدوں کی اب انھیں کوئی خواہش نہیں رہی۔ پھر بھی سلطان نے انھیں پنجاب کے ملتان ضلع میں کھوتوال کا قاضی مقرر کر دیا۔ قاضی شعیب نے اپنی زندگی کے باقی ایام وہیں گزارے۔

شعیب کے تین بیٹوں میں سے تھے ایک تھے جمال الدین جن کی شادی کھوتوال میں شیخ واجب الدین خجندی کی بیٹی قرسم بی بی سے ہوئی تھی۔ ان کے تین بیٹے ہوئے عزالدین، فرید مسعود اور نجیب الدین۔ فرید مسعود ۱۱۷۳ میں پیدا ہوئے۔ اپنے زمانے کے نمایاں ولی اللہ اور چشتی سلسلے کے تیسرے پیر کی حیثیت سے وہ شیخ فریدالدین گنج شکر کے نام سے مشہور ہوئے۔ فریدالدین کا خطاب انھیں اعلیٰ روحانی کمالات حاصل کرنے کے اعتراف میں شیخ فریدالدین عطار کے نام پر دیا گیا۔ دراصل انھیں "گنج شکر" یعنی "چینی کا خزانہ" ان کے کرامات کی وجہ سے کہا جاتا تھا جو ان کی زندگی میں واقع ہوئیں۔ ان میں سے کچھ کرامات خود ان کی بھی ذات سے منسوب ہیں۔

پہلی کرامت حضرت فرید کے بچپن سے متعلق ہے۔ اور بہت ہی دل چسپ کہانی بن گیا ہے۔ آپ کی والدہ جو کہ بہت ہی نیک اور مذہبی خاتون تھیں حضرت فرید کو پنج وقتہ نماز پڑھنے کی عادت ڈالنا چاہتی تھیں۔ انھوں نے حضرت فرید کو سمجھایا کہ جو بچے باقاعدگی سے نماز پڑھتے ہیں۔ انھیں اللہ تعالیٰ شکر بھیجتے ہیں۔ اس اعتقاد کو پختہ کرنے کے لیے وہ ہر رات ایک لفافے میں تھوڑی سی شکر ان کے تکیہ کے نیچے رکھ دیتی تھیں۔ کچھ عرصے بعد انھوں نے شکر رکھنا چھوڑ دیا لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ان کو اپنے بیٹے سے معلوم ہوا کہ شکر سے بھرا ہوا لفافہ تکیہ کے نیچے اس کو بدستور ملتا تھا۔ حضرت فرید کی والدہ نے پوچھ تاچھ کی کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ کوئی اور لفافہ رکھ دیتا ہو۔ لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ کسی نے یہ بھی حرکت نہیں کی ہے تب وہ لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچیں کہ یہ کرامت انسان کے ذریعہ نہیں بلکہ الوہی قوت سرزد ہوئی ہے۔ شاید تبھی انھوں نے حضرت فرید کے نام کے ساتھ "گنج شکر" جوڑ دیا۔

حقیقت اخریٰ کی تلاش میں بابا فرید نے چلّے کے طور پر جو ریاضت کی تھی۔ اسی سے متعلق ایک مشہور روایت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ مسلسل روزہ رکھتے رکھتے بہت کمزور ہو گئے تھے۔ ایک دن جب وہ اپنے پیر سے ملنے جارہے تھے تو وہ کیچڑ آلودہ سڑک پر پھسل کر گر پڑے اور سڑک کی کچھ مٹی ان کے منہ میں چلی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ مٹی اسی دم شکر میں تبدیل ہو گئی۔ جب وہ اپنے پیر کے گھر پہنچے تو ان کے پیر نے ان سے کہا "بابا فریدالدین مسعود ذرا سی مٹی تمہارے منہ میں جاکر چینی میں بدل گئی۔ پھر اس میں حیرت کی کیا بات اگر خدا تمہاری پوری ہستی کو شکر کا خزانہ بنا دے اور اسے ہمیشہ ہمیشہ میٹھا رکھے۔"

ایک اور روایت ہے جس میں بیان کردہ کرامت خود بابا فرید کی ذات سے منسوب ہے۔ ایک

روز بابا فرید کی ملاقات کچھ تاجروں سے ہوئی جو اپنے اونٹوں پر چینی لاد کر لے جا رہے تھے۔ بابا نے ان سے پوچھا کہ کیا لے جا رہے ہیں۔ اس ڈر سے شاید بابا فرید ان سے کچھ شکر کی درخواست کریں تاجروں نے جواب دیا کہ وہ نمک لے جا رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ چینی اسی وقت نمک میں تبدیل ہو گئی۔ جب وہ تاجر اپنی منزل پر پہنچے اور دیکھا کہ ان کی شکر کا کیا حشر ہوا ہے تو انھوں نے فوراً بابا فرید کے پاس واپس آکر توبہ کی۔ بابا کو ان پر رحم آگیا اور انھیں اخلاقی تاکید کرنے کے بعد بابا نے نمک کو پھر چینی میں بدل دیا۔ یہ خبر تیزی سے تمام پھیل گئی اور لوگ انھیں "گنج شکر" نام سے پکارنے لگے۔

گنج شکر نام سے منسوب ایک اور روایت یہ ہے کہ ایک بار بابا فرید بھوک سے بہت پریشان تھے۔ بھوک مٹانے کے لیے اضطراری طور پر کچھ کنکر انھوں نے اپنے منہ میں ڈال لیے۔ فوراً وہ کنکر چینی میں بدل گئے۔

اس قسم کی اور بہت سے کرامات بابا فرید کے بارے میں مشہور ہیں۔ مگر بہت ممکن ہے کہ ان کی زبان کی مٹھاس، ان کی نرم دلی اور محبت بھرا برتاؤ جو وہ ہر ایک سے کرتے تھے، اس وجہ سے انھیں "گنج شکر" کا خطاب ملا ہو۔ عوام بہر حال انھیں محبت اور احترام کے ساتھ "بابا" فرید کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

بابا فرید نے شروع کی تعلیم کھوتوال میں پائی، جہاں انھوں نے فارسی، عربی اور دینیات کے بنیادی قواعد سیکھے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں وہ ملتان گئے اور مولانا منہاج الدین ترمذی کی مسجد کے مدرسے میں داخل ہو گئے۔ وہاں انھوں نے قرآن مجید، اسلامی شریعت اور ان سے متعلق دیگر موضوعات کا مطالعہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کم عمری میں ہی انھوں نے پورا قرآن مجید حفظ کر لیا تھا اور دن میں ایک بار پورے کلام مجید کی تلاوت کرتے تھے۔ علم دین حاصل کرنے میں ان کی لگن، دلچسپی اور یکسوئی بہت نمایاں تھی۔ اس لگن پر ان کے سبھی استاد ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ علم اور عبادت و ریاضت میں ان کے غیر معمولی شغف کی بنا پر ان کا نام "قاضی بچہ دیوانہ" پڑ گیا۔ بہت جلد ہی پورے شہر میں وہ ایک ابھرتے ہوئے صوفی کی حیثیت سے مشہور ہونے لگے۔ بتایا جاتا ہے کہ بابا فرید کی نیک نامی اور شہرت نے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور شیخ بہاؤالدین زکریا کے بہت قریبی دوست شیخ جلال الدین تبریزی کو ان سے ملاقات کو آنے پر مجبور کیا۔ شیخ جلال الدین بابا فرید کو ایک انار بطور تحفہ دینا چاہتے تھے۔ چونکہ بابا فرید روزے سے تھے اس لیے وہ اس انار کو قبول نہ کر سکے۔ بعد

میں اس انار کا ایک دانہ ان کو پڑا ہوا ملا۔ جب انھوں نے اس دانے کو کھایا تو ایسا محسوس کیا کہ "اچانک روحانیت کی روشنی سے ان کا وجود جگمگا گیا"۔ انھوں نے بعد میں جب یہ واقعہ اپنے ہونے والے پیر حضرت قطب الدین بختیار کاکی کو سنایا تو حضرت نے فرمایا "ساری روحانی فیض ونعمت اسی ایک دانے میں تھی۔ باقی پھل میں اور کچھ نہ تھا"۔

ملتان میں مسجد سے ملحق مدرسے میں طالب علمی کے زمانے میں فرید کی ملاقات اپنے مستقبل کے پیر خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے ہوئی۔ خواجہ بختیار کاکی کو دیکھتے ہی فرید کے اندر ایک غیر معمولی سی کشش جاگ اٹھی۔ وہ دو ہم خیال اور ہم مشرب روحوں کا قران تھا اور فرید کو محسوس ہوا کہ انھیں ایسا رہنما مل گیا ہے جو انھیں روحانیت کے طریق پر آگے بڑھا سکتا ہے۔ انھوں نے خواجہ بختیار کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا اور التجا کی کہ وہ انھیں اپنا مرید کرلیں۔ انھوں نے خواجہ بختیار کاکی کے ساتھ دلّی جانے کی خواہش کا بھی اظہار کیا اور یہ درخواست کی کہ انھیں خانقاہ میں جگہ دی جائے۔ روحانیت کی طرف اس رجوع واشتیاق نے خواجہ بختیار کاکی کے دل پر بہت اثر کیا۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ انھیں اپنا مرید ضرور بنائیں گے لیکن فی الحال فرید کو اپنی تعلیم جاری رکھنی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ مدرسے میں تعلیم مکمل ہونے کے بعد فرید کو دلّی آنے کی اجازت ہوگی۔ کیونکہ تصوف میں سری ریاضت اور تربیت حاصل کرنے کا مناسب وقت تب ہی ہوگا۔ ملتان میں تعلیم مکمل ہونے کے بعد بابا فرید اعلیٰ تعلیم کے لیے قندھار گئے جہاں انھوں نے پانچ سال قیام کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد انھوں نے ایران، عراق، خراسان کا دور دور تک دورہ کیا اور مکہ معظمہ بھی تشریف لے گئے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسافرت صوفی طرز زندگی کا اہم پہلو ہے۔ سادھو، سنت، فقیر اور صوفی بے حد جہاں دیدہ ہوا کرتے ہیں۔ وہ اہم مذہبی جگہوں کی زیارت کو جاتے ہیں۔ خاص طور پر تیوہاروں اور عرس وغیرہ کے موقعوں پر جب کثیر خلقت وہاں اکٹھا ہوتی ہے۔ اس سے انھیں عام لوگوں کی ذہنیت اور نفسیات سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اور اس سے مختلف قوموں اور فرقوں کے لوگوں کے قریب آنے کا موقع ملتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے ماہرین دینیات اور صوفیوں سے ملنے اور تبادلۂ خیال کا بھی موقعہ حاصل ہوتا ہے۔ اس قسم کی مسافرت کا ایک اور پہلو بھی ہے جو متذکرہ بالا پہلوؤں سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ خانہ بدوشی سے بے تعلقی پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح سادھو یا صوفی کسی خاص جگہ سے بندھ کر نہیں رہ جاتا بلکہ پوری دنیا اس کا گھر بن جاتا ہے۔ پوری دنیا اس کا دائرۂ عمل ہے۔ وہ پوری طرح آزاد ہے کہ جہاں سکون قلب حاصل ہو وہاں اسے حاصل کرے۔

وہ ایسے لوگوں سے ربط ضبط رکھتا ہے جو اس کے ہم خیال اور ہم فکر ہوں جو کہ خود اس کی طرح ان حد اور تعین پذیر وجود کی تلاش روحانی میں مصروف ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ بابا فرید اس طرح دور دور جگہوں میں بھٹکتے رہے اور اس دوران کئی ممتاز صوفیوں اور علماء دین سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اتنا کہنا کافی ہوگا کہ جب بابا فرید اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اور طویل مسافرت کے بعد ہندوستان واپس لوٹے تب یقیناً اپنی لیاقت اور خاندانی وجاہت کے باعث ان میں وہ سب صلاحیتیں موجود تھیں جن کی بنا پر وہ سلطانی حکومت میں اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے پر فائز ہو سکتے تھے۔ لیکن فرید کو ان سب چیزوں کی پرواہ نہ تھی۔ انھیں دنیاوی دولت اور اونچے عہدے میں نہ دلچسپی تھی اور نہ ضرورت۔ انھیں تو روحانیت کی تلاش تھی۔ اور دلّی پہنچتے ہی وہ سیدھے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی خانقاہ میں پہنچے اور ایک مرید کی سادہ زندگی گزارنی شروع کر دی۔

اس کے پہلے کہ ہم تصوف کے میدان میں بابا فرید کی روحانی تربیت کا ذکر کریں ان تین اہم اثرات کا ذکر بیجا نہ ہوگا جنھوں نے بابا فرید کی طرز زندگی کو متاثر کیا۔ سب سے پہلا اور سب سے اہم ترین اثر فرید پر ان کی ماں قرسم بی بی کا پڑا۔ جنھوں نے (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) ان کو پنج وقتہ نماز پڑھنے کی نصیحت کی اور اس کی اہمیت کا احساس بھی دلایا۔ وہ خود بہت مذہبی خاتون تھیں اور ان کا بیشتر وقت نماز و عبادت میں گزرتا تھا۔ جس کو بھی ان کی قربت کا شرف حاصل ہوتا وہ ان کی پاکیزگی اور تقدس سے متاثر ضرور ہوتا۔ اس سلسلے میں بہت سی روایات بیان کی جاتی ہیں۔ ہمارے مقصد کے لیے صرف ایک روایت کا ذکر کافی ہوگا۔ ایک رات کچھ چور ان کے گھر میں گھس گئے اس وقت وہ مراقبہ اور عبادت میں محو تھیں۔ جب چوروں نے ان کو دیکھا تو وہ ان کے روحانی نور سے متاثر ہو کر ان کے پیروں پر گر پڑے، انھوں نے توبہ کی اور نیک زندگی گزارنے کی قسم کھائی۔ ان میں سے ایک چور بعد میں درویش ہو گیا۔ بہت عرصے تک لوگ اس کی مزار پر سکون قلب کی تلاش میں جاتے تھے اور اسے یاد کرتے تھے۔ قرسم بی بی نے فرید میں مذہبیت، عبادت کا شوق اور خدا سے محبت کا جذبہ پیدا کیا۔ بچپن سے ہی ان کی ماں نے خدا سے لو لگا کر صوفیانہ زندگی گزارنے کا نصب العین ان کے دماغ میں اس حد تک نقش کر دیا تھا کہ آگے چل کر یہی ان کی زندگی کا واحد مقصد بن گیا۔

ان پر دوسرا اثر تھا ان کے والد جمال الدین کا۔ جمال الدین قرآن مجید کے ذہین اور زود فہم عالم تھے بعد میں وہ کھوتوال کے قاضی ہو گئے۔ انھوں نے فرید کو علم سے لگاؤ اور اسلامیت میں پرجوش عقیدت و ریاضت کی تعلیم دی۔ بابا فرید کے گھر کا ماحول پارسائی اور علمیت میں غرق تھا۔ زندگی

سادہ تھی لیکن مذہبی ماحول اور دینی تعلیمات سے تونگر اور پر وقار تھی۔ آنے جانے والے مہمان زیادہ تر صوفی، عالم دینیات یا شریعت میں دل چسپی رکھنے والے لوگ تھے۔ اس لیے کوئی حیرت کی بات نہیں کہ ان سب اثرات کی بنا پر فرید نے جن کا پہلے ہی سے رجحان روحانیت کی طرف تھا، اپنی زندگی کو علم دینیات حاصل کرنے کے لیے وقف کرنے کے ارادہ کو اور مضبوط کر دیا۔

تیسرا اثر تھا ان کے پیر خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا، جن کی خانقاہ میں فرید اپنے سفر سے لوٹنے کے بعد شامل ہوئے۔ خواجہ بختیار کاکی اپنے زمانے کے ممتاز ترین صوفیوں میں تھے۔ انھوں نے اپنی خانقاہ دلّی میں بنائی تھی۔ وہ افغانستان کے ایک شہر اوش کے رہنے والے تھے۔ اوش حضرت منصور حلاج کے قائم کردہ صوفی سلسلے کا مشہور مرکز تھا۔ خواجہ نے اعلیٰ تعلیم بغداد میں حاصل کی۔ بغداد اس زمانے میں اسلامی تصورات کا عظیم تعلیمی مرکز تھا۔ اس کے علاوہ اس زمانے کے اکثر نمایاں صوفیوں کو بھی اس شہر سے نسبت تھی۔ یہیں پر خواجہ بختیار کاکی کی ملاقات شیخ معین الدین چشتی سے ہوئی، اور وہ ان ولی اللہ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً ان کے مرید ہو گئے۔ شیخ چشتی کے ہندوستان روانہ ہونے کے کچھ ہی دن بعد حضرت بختیار کاکی ان کے پیچھے پیچھے ہندوستان پہنچے۔ جب خواجہ دلّی پہنچے تو سلطان التمش نے ان کی دینی عظمت کے اعتراف میں ان کو شیخ الاسلام کا عہدہ پیش کیا۔ مگر خواجہ نے اس عہدے کو قبول نہ کیا۔ انھوں نے اپنی خانقاہ قائم کرنے اور پھر اپنے آپ کو تصوف کی تعلیم و تربیت کی خاطر وقف کر دینے کو ترجیح دی۔ اور اس خانقاہ میں اپنے مرشد کے ساتھ رہنے کے لیے بابا فرید آئے۔

خانقاہیں صوفیوں کے لیے اک طرح کے اقامت خانے کے مانند تھیں جہاں زندگی نہایت باضابطہ ترتیب سے گزاری جاتی تھی۔ خانقاہیں تین طرح کی ہوا کرتی تھیں۔ پہلی۔ وہ بڑی خانقاہ جہاں صوفیوں اور مہمانوں کے لیے الگ الگ کمرے متعین تھے۔ دوسری جماعت خانے جہاں شاگرد مختلف گروہوں میں ایک ساتھ رہتے تھے۔ تیسری وہ چھوٹی خانقاہیں جنھیں زاویہ بھی کہتے تھے، جہاں صوفی دنیا سے بالکل کنارہ کش ہو کر رہتے تھے۔ خانقاہوں میں رہنے والے بھی تین قسم کے ہوا کرتے تھے: چنیدہ شخصیتیں، رفقا و ہم نشیں اور خادمان۔ خانقاہ میں مہمانوں کی پذیرائی ہوتی تھی لیکن ان سے یہ توقع رکھی جاتی تھی کہ وہ تین دن سے زیادہ نہ ٹھہریں۔ لیکن اگر وہ زیادہ دن قیام کرنا چاہتے تو پھر انھیں بھی بطور خادم کے کام کرنا پڑتا تھا۔ ان خانقاہوں میں باقاعدہ زندگی گزارنے کے سخت اصول وضع کیے گئے تھے۔ منہ اندھیرے سے لے کر رات ڈھلے تک زندگی کے

ہر پہلو اور ہر عمل کے لیے قاعدے مقرر تھے۔ لباس پہننے کے لیے اصول تھے، کھانا کھانے کا وقت مقرر تھا، مہمان نوازی کا طریقہ متعین تھا، شیخ اور دیگر بزرگوں کو مخاطب کرنے کا مخصوص انداز تھا، عبادت کا وقت اور چلے کے طور پر ریاضت کرنے کے طریقے متعین تھے۔ کسی بھی قسم کی بے قاعدگی یا بے ضابطگی کی سزا پہلے سے متعین تھی۔ اس کے علاوہ ان کی سماجی زندگی کے تین اور پہلو تھے۔ ایک تھا روحانی اور وجدانی فیضان کے لیے سماع، دوسرا تھا زمانۂ گذشتہ کے اولیاء اللہ کا عرس منانا، اور آخری تھا "لنگر" یعنی ایک قسم کی اجتماعی دعوت جس میں ہر شخص شریک ہو سکتا تھا۔

خانقاہ میں زندگی اس کے منتظم یعنی شیخ کے گرد گھومتی تھی۔ اور وہی وہاں کی روحانی اور سماجی زندگی کی رہنمائی کرتے تھے۔ ہر قسم کے لوگ نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو اور دیگر مذہبوں کے لوگ بھی خانقاہ میں آتے اور رہنمائی اور فیض و برکت کی درخواست کرتے۔ دوسرے مذہبوں کے جوگی اور مہاتما بھی دینیاتی مسائل پر بحث و مباحثہ کرنے آتے۔ صوفی اسلام کے مبلغ کی طرح سے بھی کام کرتے اور رسول ؐ کا پیغام دوسروں تک پہنچاتے۔

صوفی اپنی روزی کے لیے یا تو اوسر زمین میں کھیتی کرتے یا پھر لوگوں کے دئے ہوئے ہدایا پر گزر بسر کرتے۔ مگر شرط یہ تھی کہ کسی سے کوئی ہدیہ مانگا نہ جائے۔ مریدوں کو مانگ کر کھانے کی بھی اجازت تھی۔ جو کچھ بھی تحفہ تحائف میں ملتا وہ خانقاہ میں رہنے والوں میں بانٹ دیا جاتا۔ شہزادوں اور امیر تاجروں سے جو قیمتی ہدایا ملتے وہ جمع نہیں کیے جاتے تھے بلکہ فوراً غریبوں میں تقسیم کر دئے جاتے تھے۔ جائداد یا باقاعدہ رقم قبول نہیں کی جاتی تھی۔ سہروردیوں کو چھوڑ کر دوسرے سلسلوں کے صوفی حکومت کی سرپرستی قبول نہیں کرتے تھے۔ عام طرز زندگی سادگی پر مبنی تھا مفلسی اور ریاضت روحانی ترقی کے لیے لازمی سمجھے جاتے تھے۔

صوفی عام طور پر پیوند لگے ہوئے لبادے پہنتے تھے اور سر کے بال منڈاتے تھے۔ شیخ کا لبادہ، جائے نماز، جوتیاں، چھڑی اور تسبیح کو مقدس اور متبرک سمجھا جاتا تھا اور ان کی پارسائی کی یہ علامتیں ان کے گزرنے کے بعد ان کے خلیفہ کو ملتی تھیں۔ شیخ اپنی وصیت بھی چھوڑ جاتے تھے جس کی "خلافت نامہ" کہا جاتا تھا۔ خلافت نامے میں شیخ اپنا خلیفہ نامزد کرتے تھے۔ اس میں روحانی کام جاری رکھنے اور اسلام کی حمایت اور تبلیغ کی تاکید بھی درج رہتی تھی۔ اس طرح سلسلہ کا تسلسل قائم رہتا تھا۔ زیادہ تر خلیفہ کو یہ رائے دی جاتی کہ وہ کسی اور علاقے میں خانقاہ تعمیر کریں اور

توکل اور خدمت گزاری کی مثالی زندگی سے تصوف کا پیغام لوگوں تک پہنچا ہیں۔

یہ بتانا ضروری ہے کہ جن اصولوں کا ذکر ابھی ہم نے کیا ہے وہ خانقاہی زندگی کا محض ایک ڈھانچہ ہیں۔ اس کو گوشت پوست تو شیخ کی شخصیت اور مثالی زندگی عطا کرتی تھی۔ یہ شیخ ہی تھے جو دلوں میں عقیدت کا جذبہ بھرتے اور ماحول میں روحانیت کی تلاش کا جوش اس شدت سے پیدا کر دیتے کہ خانقاہ میں رہنے والے خوشی خوشی عام زندگی کے تقاضے اور خواہشات ترک کر کے اس طرح رہتے گویا وہ خدا کو حاضر و ناظر دیکھ رہے ہیں۔ صوفی کی انتہائی تمنا وصول الی اللہ ایک لمحے کے لیے بھی نظر انداز نہ ہوتی تھی اور دور ریاضت میں ہر طریقے کا استعمال صرف اسی مقصد کے لیے تھا کہ حقیقت اخریٰ سے دلوں کی ہم آہنگی برقرار رہے۔

جب بابا فرید خواجہ بختیار کاکی کی خانقاہ میں داخل ہوئے تو انھیں اپنے پیرومرشد کی تیز نگاہ اور ان کی روحانی تاثیر سے بھرپور رہنمائی میں صوفی کی سخت تربیت اور ریاضت سے گزرنا پڑا۔ لیکن اوائل زندگی کے حالات نے انھیں ان کڑے منصوفانہ اشغال و اذکار کے لیے پہلے ہی سے تیار کر دیا تھا جو ان کے پیر نے بتائے۔ انھوں نے خوشی سے وہ لمبی اور اکیلی شب بیداریاں قبول کیں جو انھیں اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے گزارنی تھیں۔ انھوں نے اپنی مرضی سے چلّے اور روزہ کی سختیاں اور ان اعمال و اشغال کی جسمانی اذیتیں برداشت۔

صوفیوں نے روحانی تنویر کے لیے جسمانی اذیت کا تصور ہندوستان کے جوگیوں سے ماخوذ کیا ہے۔ بہت ساری جوگی ورزشوں کو تربیت تزکیہ نفس کے لیے ضروری سمجھا گیا، خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جو سریت کی دنیا میں ابھی داخل اور روشناس ہوئے ہوں۔ سانس روکنے، جنسی خواہشات پر قابو پانے، دنیا کی آلودگی اور موت سے خود کو الگ کرنے کے لیے خاص ورزشیں تھیں اور دماغی ارتکاز کے لیے بھی ورزشیں تھیں۔ جوگیوں نے "دھیان" بھی شروع کیا۔ "دھیان" میں کسی شے کو توجہ کا مرکز بنا لیا جاتا ہے۔ "دھیان" کا اختتام "سمادھی" میں ہوتا ہے۔ گہرا ارتکاز روحانیت کی اس دہلیز تک پہنچاتا ہے جہاں پہنچنے پر ظاہری دنیا کا احساس ختم ہو جاتا ہے، لیکن "دھیان" اس سے آگے کی منزل ہے جہاں ماضی، حال اور مستقبل معدوم ہو جاتے ہیں۔ وقت تھم جاتا ہے اور محدود لامحدود میں ضم ہو جاتا ہے۔ وجود اور تکوین متحد ہو جاتے ہیں اور فرد صرف ایک فرد نہیں رہ جاتا بلکہ عالم گیر روح کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی نہ ختم ہونے والا قلبی سکون، ایک قسم کی روشنی پورے دماغ کو منور کر دیتی ہے۔ اور سارے خوف، تناؤ،

جسمانی بیماریاں، ساری رکاوٹیں، بندشیں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہی وہ روحانی تجربہ ہے جس کی صوفیوں کو تلاش رہتی ہے۔ اور یہی تجربہ تھا جس کو بابا فرید زہد، ترک دنیا اور مراقبے کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بابا فرید نے گوشہ نشینی اختیار کرلی اور زیادہ سے زیادہ وقت تنہائی میں گزارنا شروع کیا۔ اپنے پیر کے بتائے ہوئے خاص انداز میں بیٹھ کر وہ خدا کے نام کا ذکر کرتے تھے۔ وہ چِلّہ بھی کھینچتے تھے یعنی چالیس دن تک اپنے کو اکیلے کمرے میں بند کر کے اسم ذات کا مراقبہ کرتے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بابا فرید چِلّۂ معکوس یعنی الٹا لٹکنے کی ریاضت بھی کیا کرتے تھے۔ اس چلّے کی مدت ہے چالیس راتیں۔ ہر رات صوفی کے پاؤں باندھ کر اسے کنویں میں لٹکا دیا جاتا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ عمل وہ واقعی کیا کرتے تھے یا یہ محض روایت ہے جو ان کے ماننے والوں نے عام کی ہے۔ کچھ روایتوں میں تو اس حد تک کہا گیا ہے کہ ان کی یہ نمازِ معکوس چھ مہینے تک چلتی تھی اور کچھ کے مطابق دس سال تک۔ اس چلّے کی مدت کا سوال الگ ہے، اور بہر حال بابا فرید کے سب چاہنے والے معتقد یہ مانتے ہیں کہ اچھ میں مسجدِ ج کے پاس والے کنویں میں وہ چِلّۂ معکوس کیا کرتے تھے۔ بابا فرید جس ثابت قدمی سے اپنا کام کرتے تھے اور ریاضت کے دوران ارادے کی جس پختگی کا انھوں نے مظاہرہ کیا ان سب کو دیکھتے ہوئے ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ انھوں نے یہ چِلّہ ضرور کھینچا ہوگا۔ اس کے علاوہ گورو گرنتھ صاحب میں بابا فرید کے کچھ اشلوک ہیں جن سے ہمیں ان کی ریاضتوں کا بالواسطہ ثبوت ملتا ہے۔ دو اشلوک ۹۰ اور ۹۱ خاص توجہ کے لائق ہیں:

فرید میرا سوکھا ہوا جسم ہڈی کا ڈھانچہ بن گیا ہے
کوے میری ہتھیلی اور تلوؤں پر چونچ مارتے ہیں
ابھی تک اللہ تعالیٰ میری مدد کو نہیں آئے
اللہ کے اس بندے کی بدقسمتی تو دیکھو۔

۲۹۱۰۱

اے کوّو! تم نے اس ہڈی کے ڈھانچے کو ڈھونڈ ڈالا جو کہ میرا جسم ہے
اور میرا سب گوشت کھا لیا۔
لیکن ان دو آنکھوں کو مت چھونا، کیونکہ مجھے ابھی
دیدارِ محبوب کی آس ہے۔

بابا فرید کنوئیں میں اس حالت میں لٹکے ہوئے ہیں کہ سر نیچے ہے، پاؤں اوپر۔ چڑیوں نے ان کے

جسم میں گھونسلے بنالیے ہیں۔ لیکن ان کی تلاش، خدا تک پہونچنے کی ان کی کوشش ابھی پوری نہیں ہے۔ دوسرے اشلوک میں وہ چڑیوں سے گزارش کرتے ہیں کہ حالانکہ ان کا جسم ہڈی کا ڈھانچہ بن گیا ہے پھر بھی چڑیاں ان کے آنکھوں کو نقصان نہ پہنچائیں تا کہ ان میں اپنے معشوق کو دیکھنے کی طاقت رہے۔ یہ انتہا تھی ان ریاضتوں کی جو بابا فرید نے وصول الی اللہ کی خاطر برداشت کیں۔ ہمیں اس سے مطلب نہیں کہ اپنی زندگی کے کس دور میں انھوں نے چلۂ معکوس ریاضت کے طور پر کیا۔ اہم بات جس پر ہمیں زور دینا ہے تو یہ ہے کہ زاہد مرتاض کی حیثیت سے انھوں نے مشکل سے مشکل ترین آزمائشوں کا سامنا کیا تا کہ وہ اپنی منزل حاصل کرسکیں

حالانکہ نفس کشی اور زہد سے تزکیہ نفس اور روحانی دستورالعمل حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے لیکن بحیثیت خود وہ ایک منفی وصف ہے۔ اگر زہد کا نتیجہ ہے ترک دنیا تو پھر اس کے ساتھ محبت خدا بھی ہونا ضروری ہے تاکہ روحانی تربیت میں توازن قائم رہے۔ بابا فرید کا زہد خدا کی ہستی کے حقیقی، پرجوش اقرار صالح سے منسلک ہے۔ ان کے لبوں پر ہمیشہ یہ الفاظ رہتے تھے "میں تیرے لیے جیتا اور تیرے لیے مرتا ہوں" بابا فرید کو جوگیوں کی طرح دنیا ترک کر کے جنگلوں میں بس رہنے میں اعتقاد نہیں تھا۔ وہ لوگوں کے دکھ درد سے منہ موڑ کر جنگل میں جاکر عبادت کرنے کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ان کی زندگی خدائے پاک کے لیے وقف تھی۔ وہ اسی کی خاطر جیئے اور اسی کی خاطر انھوں نے جان دی لیکن ساتھ ہی ساتھ انسانوں سے بھی بابا فرید کو گہرا لگاؤ اور محبت تھی۔ وہ عام انسان کی مدد کرنا اور اس کی زندگی سنوارنا اور بہتر بنانا چاہتے تھے، خاص طور پر اخلاقی اور روحانی نظریہ سے۔ یہی دو مقاصد، یعنی ایسے راستے کی تلاش جس کے ذریعے خدا تک پہنچا جاسکے اور خدا کے بندوں کی خدمت کی جاسکے، بابا فرید کی زندگی کے سب سے اہم نصب العین تھے اور ہمیشہ رہے۔

خانقاہ حضرت بختیار کاکی میں قیام کے دوران، بہ وجہ عبادت و ریاضت بابا فرید کی شخصیت نے ایک قسم کا نورانی ہالہ حاصل کرلیا تھا۔ ایک دفعہ ہندوستان میں چشتی سلسلے کے بانی خواجہ معین الدین اپنے مرید حضرت بختیار کاکی کی خانقاہ میں تشریف لائے۔ جب انھوں نے فرید کو دیکھا تو فرمایا" بابا بختیار، آپ کے ہاتھ میں ایسا عالی ظرف شاہین ہے جو کہ جنت کے مقدس شجر کے علاوہ اور کہیں نہیں گھونسلا بنائے گا۔ فرید وہ چراغ ہے جو درویشوں کے سلسلے کو منور کرے گا" حضرت معین الدین چشتی بابا فرید سے اس قدر خوش ہوئے کہ انھوں نے خواجہ بختیار کاکی سے درخواست کی کہ وہ اپنے اس شاگرد کو دعائے برکت دیں۔ خواجہ بختیار کاکی نے مودبانہ عرض کیا کہ اپنے مرشد کی

موجودگی میں ان کا خود شاگرد کو برکت عطا کرنا اچھا نہ معلوم ہوگا۔ چنانچہ دونوں بزرگوں نے ایک ساتھ فرید کو دعا دی۔ خلیق احمد نظامی نے اس واقعے کے بارے میں بہت درست لکھا ہے کہ ”چشتی سلسلے کی تاریخ میں یہ ایک بے نظیر اعزاز تھا۔ نہ ان سے پہلے نہ ان کے بعد کسی بزرگ کو اس طرح پیر اور پھر پیر کے بھی مرشد نے دعائے برکت دی تھی“ خواجہ نظام الدین کے شاگرد امیر خورد کے بقول اس کا مطلب تھا:

دونوں بزرگوں نے دونوں جہان تم کو بخشے
اپنے دور کے ان شہنشاہوں سے تم نے بادشاہی حاصل کی ہے
اس دنیا اور اس دنیا دونوں کی مملکت یقیناً تمہاری ہے
حقیقت تو یہ ہے کہ ساری کائنات تم کو سونپ دی گئی ہے۔

یہ کوئی حیرت کی بات نہ تھی، ان کی نمایاں بزرگ شخصیت کے ساتھ ان کی پارسائی، ریاضت اور عبادت کی نیک نامی کے باعث بابا فرید کی شہرت لوگوں میں تیزی سے دور دور تک پھیل گئی تھی۔ حضرت قطب الدین کی خانقاہ پر عقیدت مندوں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ لوگ بابا فرید سے تعویذ لکھنے کی اور دعا کرنے کی درخواست کیا کرتے تھے۔ دیہات کے لوگوں میں یہ عام اعتقاد تھا کہ تعویذ کے ذریعہ برائی اور بیماری کا اعلاج ہوجاتا ہے۔ اس طرح کے معتقدوں کی تعداد برابر بڑھتی گئی اور اس انتہا تک پہنچ گئی کہ بابا فرید کو یہ محسوس ہونے لگا کہ تعویذ لکھنے کا کام ان کی عبادت اور دھیان میں مزاحم ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے مرشد خواجہ قطب الدین کی رائے طلب کی لیکن خواجہ نے جو جواب دیا وہ خاص صوفیانہ رنگ کا تھا۔ فرمایا ”دیکھو یہ معاملہ ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ ہم تو محض ذریعہ ہیں۔ جو تعویذ تم لکھتے ہو ان میں خدا کا نام رہتا ہے اور خدائے پاک ہی شفا دیتا ہے اس لیے تم تعویذ لکھتے رہو“ لہٰذا بابا فرید نے تعویذ لکھنے اور ضرورت مندوں کو نقش بانٹنے کا کام جاری رکھا۔

اسی طرح کی ایک صورت حال میں جب بابا فرید کے مرید حضرت نظام الدین کو تعویذ لکھنے کا کام پورا کرنے میں مشکل ہونے لگی تو بابا فرید نے ان سے کہا ”تم ابھی سے تعویذ لکھنے سے پریشان ہوگئے ہو۔ اس وقت تمہاری کیا حالت ہوگی جب بہت سارے ضرورت مند تمہارے دروازے پر آئیں گے اور تم سے دعا کی درخواست کریں گے“۔

جب بابا فرید کا دور ریاضت پورا ہوگیا تب ان کے مرشد خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے

انھیں صلاح دی کہ وہ ہانسی میں جاکر اپنی خانقاہ قائم کریں۔ ہانسی ایک پرسکون جگہ تھی۔ بابا فرید نے سوچا کہ غریبوں اور ضرورت مندوں کی مدد میں جو کچھ ان سے ہوسکتا تھا کرنے کے بعد وہ دہلی کی بھیڑ بھاڑ سے نجات پاکر عبادت اور دھیان میں زیادہ وقت گزار سکتے تھے۔ بابا فرید کے ہانسی روانہ ہونے سے پہلے خواجہ قطب الدین نے فاتحہ پڑھوائی اور یہ اعلان کیا کہ ان کے بعد فریدالدین گنج شکر ان کے جانشین ہوں گے اور اپنی جائے نماز اور عصا انھیں عنایت کیا۔ پیشوائی کی دوسری علامتیں فرید کو ان کے مرشد کے گزر جانے کے بعد منتقل ہوئی تھیں۔

لیکن ہانسی اتنی پس ماندہ جگہ نہیں تھی جیسا کہ بابا فرید نے سوچا تھا۔ شہر ہانسی (ضلع حصار) دراصل لشکرگاہ تھا۔ اس کی خاصی تاریخی اہمیت بھی تھی، ترکوں اور راجپوتوں کے درمیان جنگوں کے ذکر میں ہانسی کا نام آتا ہے۔ بابا فرید نے کئی سال ہانسی میں گزارے۔ کچھ مورخوں کے مطابق بارہ اور کچھ کے مطابق بیس سال وہ ہانسی میں رہے۔ یہ فطری بات تھی کہ بابا فرید نے اپنی انسان دوستی، پارسائی اور جذبۂ محبت سے ہانسی اور نواح ہانسی کے لوگوں کا دل جیت لیا اور ہر دل عزیز ہوگئے۔ انبیا اور اولیا کی سوانح حیات لکھنے والے کچھ مصنفوں نے بابا فرید کی حیات کے اس دور کو ان کرامات کے تذکروں سے بھر دیا ہے جو ان کی ہستی سے منسوب ہیں۔ میکس آرتھر مکالف کی کتاب، اگرچہ وہ بیسویں صدی میں لکھی گئی ہے، لیکن پھر بھی ان کرامات کے ذکر سے بھری ہوئی ہے۔ مگر بابا فرید جیسے بزرگوں کو اپنا روحانی رتبہ منوانے کے لیے کرامت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کے پاس وہ سب صفات تھے جو کہ کسی صوفی کو انسانوں میں بے حد احترام اور پرستش کے قابل اور محبوب خدا بنا دیتے ہیں۔ شیخ معین الدین نے ان صفات کی ہی تعریف کی تھی جب انھوں نے کہا کہ خدا ہر اس بندے کو چاہتا ہے جس میں "دریا کے مانند سخاوت ہو، سورج جیسی کریم النفسی ہو اور دھرتی کے مانند مہمان نوازی ہو" حالانکہ بابا خود بہت افلاس سے رہتے تھے اور اکثر انھیں کھانا نہ ہونے کی وجہ سے روزہ رکھنا پڑتا تھا لیکن ان کی خانقاہ کے دروازے ہمیشہ سب کے لیے کھلے رہتے تھے اور ہر مہمان کو فریدی لنگر میں کچھ نہ کچھ کھانا ضرور ملتا تھا۔ نہ صرف مسلمان بلکہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی بابا فرید کی دعائیں لینے آتے تھے اور ان کی مدد سے ان اوہام اور خوف سے بھی چھٹکارا پاتے تھے جن سے وہ پریشان رہا کرتے تھے۔ وہاں جوگی اور سادھو بھی روحانی مسائل پر غور و فکر کرنے اور ان کا حل تلاش کرنے کی غرض سے حاضر ہوتے تھے۔ بابا فرید ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ اپنے رویئے میں کوئی فرق نہیں رکھتے تھے۔ انھیں راسخ العقیدہ علما کا یہ نظریہ

کہ غیر مسلم کا فریبی، ناگوار لگتا تھا۔ اس کے علاوہ، صوفی ہونے کی وجہ سے ان کا کوئی تبلیغی مرکز یا مشن نہیں تھا۔ ہاں اگر کوئی اسلام قبول کرنے کی خواہش کا اظہار کرتا تو اسے بہ خوشی اسلام کی جماعت میں قبول کیا جاتا۔ وہ قرآنی تاکید کے پابند تھے کہ "مذہب میں کوئی جبر نہیں ہے"۔ لیکن یہ سچ ہے کہ خدا کی وحدت اور انسانی بھائی چارے پر ان کا اصرار، ان کے طرز زندگی کی پارسائی، ان کی سیرت کی پاکیزگی اور سب سے بڑھ کر جس قسم کی سخاوت، نرم دلی اور بے غرض و بے نفس خدمت کا ثبوت انھوں نے دیا، جس میں مذہب و ملت کی قید نہ تھی، ان سب کو دیکھ کر ہزاروں کی تعداد میں ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔ خاص طور پر نیچی ذات کے ہندوؤں نے جنھیں پشتوں سے سماج میں ذلیل اور گرا ہوا سمجھا جاتا تھا۔ بابا فرید صلح کل اور وسیع المشربی کی علامت کے طور پر مختلف مذہب و ملت کے لوگوں میں قائم ہوئے۔ امیر حسن سنجری نے "فوائد الفواد" میں لکھا ہے کہ ایک بار بابا فرید کو کسی نے قینچی نذر کی۔ بابا نے جواب دیا "مجھے سوئی دیجیے کیونکہ میں سیتا ہوں کاٹتا نہیں"۔ وہ لوگوں کو ایک دوسرے کے عقائد کی بہتر فہم کے ذریعہ قریب لانا چاہتے تھے۔ ایک مذہب کے دوسرے مذہب پر برتری اور تفوق ثابت کرکے آپس میں اور پھوٹ نہیں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ بابا فرید کو شریعت سے جو گہری عقیدت تھی وہ طریقت کی بنیاد بنی۔ انھوں نے زندگی بھر محبت کا راستہ اختیار کیا اور اسی طرز زندگی نے طریق صوفیت کا کام کیا۔ اس عشق روحانی میں خدا اور مخلوق دونوں کی محبت شامل تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بابا فرید نے اصرار کیا کہ خدا کو چاہنے اور اس تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہے اس کی مخلوق سے محبت کرنا۔ ہانسی میں انھوں نے باہمی پیار اور محبت کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی اور محبت کے ذریعہ اختلافات، تفریق، پھوٹ اور فرقہ وارانہ احساس کے ذریعے پیدا ہونے والی نفرت کو دور کرنا چاہا۔ یہ انسان دوستی اور عقیدۂ نجات تمام صوفی اولیاء اللہ کا مذہب بن گیا جس سے انھیں آج تک ہندو مسلمان اور سکھوں کا پیار ملا۔ اس پر آشوب زمانے کے غیر معین سیاسی اور سماجی حالات کو دیکھتے ہوئے ایک طرح کا انقلاب تھا جو بابا فرید نے لوگوں میں پیدا کیا۔

ابھی بابا فرید ہانسی میں ہی تھے کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے انتقال کی خبر آئی۔ بابا فرید دہلی تشریف لے گئے۔ انھیں شہنشاہ صوفیاں کا خرقہ اور سجادہ سونپ دیا گیا اور انھیں چشتی سلسلے کا سربراہ تسلیم کر لیا گیا۔ دلی میں زندگی ہانسی سے بالکل مختلف تھی۔ پورا دن سماجی فرائض انجام دینے، مذہبی مباحث اور ملاقاتوں اور ان اہم مہمانوں سے ملنے میں گزر جاتا جو بابا سے

ذاتی ملاقات پر اصرار کرتے تھے۔ اس کے علاوہ سیاسی سازشوں کا ایک زیر بب ماحول تھا جس میں اکثر مذہبی رہنما بھی شامل رہتے تھے۔ جاگیر بیت کی فطرت ہی ہے کہ اس کے ذریعہ تناؤ، تفریق، اور ابن الوقتی پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ اسلامی حکومت میں قانون شریعت مذہب کا حصّہ ہے، اس لیے سیاست اور مذہب مخلوط ہو جاتے ہیں اور ائمۂ شریعت کو مجبوراً سیاسی سربراہوں کا محکوم بن جانا پڑتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ حکومت کے بارے میں کٹر مولویوں اور صوفیوں کے رویئے میں جو فرق ہے اس کو ملحوظ رکھا جائے۔ صوفیاء اور علماء کے درمیان معاندت کے کچھ فلسفیانہ اور مابعد الطبعیاتی وجوہ تھے۔ صوفیوں کا اصرار براہ راست لقائے خداوندی تھا اور وہ روحانی ریاضت کے ذریعہ دنیا ہی میں وصول الی اللہ کا امکان دیکھتے تھے۔ علماء کا عقیدہ روز قیامت پر تھا۔ اس کے علاوہ انھیں اس بات پر بھی پورا اعتقاد تھا کہ انسان کو اس کے فعل کے مطابق جنت یا دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ لہٰذا علماء نے دنیائے فانی میں لقائے خداوندی کے حصول کی بڑی شدت سے تردید کی۔ ان کا کہنا تھا کہ انسان کا خدا کے ساتھ کسی بھی طرح سے ذاتی یا قلبی رشتہ نہیں ہو سکتا۔ یہ درجۂ امتیازی صرف خدا کے رسولؐ کو حاصل ہے۔ اس لیے لقائے خداوندی حاصل کرنے یا ہستی الٰہی میں ضم ہو جانے کا سوال اٹھتا ہی نہیں ہے۔ انسان خدا سے صرف رحم و فضل کی امید کر سکتا ہے اور جنت میں مسرت کامل کی امید رکھ سکتا ہے۔ لیکن صوفیوں کا دعویٰ تھا کہ ان کے درمیان ایسے بھی صوفیاء تھے جو ایک لمحہ بھی لقائے خداوندی کے بغیر نہیں جی سکتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ صوفیاء اس دنیا کی دولت اور اس دنیا کی جنت اور دوزخ سے یکساں بے اعتنائی برتتے تھے۔

یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ چشتی سلسلے کے صوفی اپنے مریدوں کو حکومت سے ہر قسم کے رشتے کو توڑنے کا حکم دیتے تھے۔ لیکن جب ریاست مطلق العنان اور مطلق الحکم ہو تو حکومت سے پوری طرح پہلو بچانا یا کنارہ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، خود بابا فرید کا حکومت کی طرف جو رویہ تھا اس کی وضاحت دو وقعات سے بخوبی ہو جاتی ہے۔ جب سلطان بلبن نے انھیں نذرانے کے طور پر چار گاؤں اور کچھ نقدی پیش کی تو بابا فرید نے نقد پیش کش کو قبول کر لیا اور فوراً غریبوں میں تقسیم کر دیا۔ اور یہ کہہ کر گاؤں لینے سے انکار کر دیا کہ اگر میں یہ گاؤں قبول کر لوں تو میں جاگیر دار بن جاؤں گا، صوفی نہ رہوں گا، اور اس طرح درویشوں میں میرے لیے کوئی جگہ نہ رہے گی۔ ایک دفعہ اور جب وہ اس بات پر بالکل مجبور ہو گئے کہ وہ ایک شخص کی سفارش

سلطان بلبن سے کریں تو انھوں نے یوں لکھا۔ "میں ان کا مسئلہ پہلے خدا کے سامنے اور پھر تمہارے سامنے رکھتا ہوں۔ اگر تم اسے کچھ دو گے تو تم اس لیے شکریہ کے حق دار ہو گے کہ تم اس انعام کا ذریعہ ہو لیکن حقیقت میں خدا ہی واحد دینے والا ہے۔ اگر تم کچھ دینے سے انکار کرتے ہو تو وہ اس لیے کہ تم اس معاملے میں بے بس ہو کیونکہ صرف خدا ہی انکار کرنے کا حق رکھتا ہے۔" اس موضوع پر اپنے مریدوں کے لیے بابا فرید کی ہدایت غیر مبہم تھی۔ "اگر تم اپنے درجے میں سرفرازی چاہتے ہو تو شاہی خاندان کے لوگوں سے میل جول مت رکھو۔"

دہلی کی طرز حیات اور سیاست بھرے ماحول سے رنجیدہ ہو کر بابا فرید ہانسی لوٹ آئے لیکن یہاں پر بھی ان کو وہ سکون نہ ملا جس کی انھیں تلاش تھی۔ جہاں جہاں وہ جاتے عقیدت مندوں کی ایک بھیڑ اکٹھا ہو جاتی جو ان کا بہت سارا وقت لے لیتے تھے۔ کسی اندرونی خواہش نے انھیں ہانسی چھوڑ کر کوئی خاموش، ویران، سنسان مقام ڈھونڈنے پر مجبور کیا جہاں پر وہ یکسوئی سے عبادت کر سکیں اور اس وصل الٰہی کو حاصل کر سکیں جو روحانی جد و جہد کا مقصد کل ہے۔ انھوں نے ہانسی کی خانقاہ اپنے مریدوں میں سے کسی ایک کے حوالے کر دی اور خود اجودھن چلے گئے۔ اجودھن بعد میں پاک پٹن کے نام سے مشہور ہوا اور اب پاکستان کے منٹگمری ضلع میں ہے۔ (جس کا نیا نام اب ساہی وال ہے)۔

بابا فرید نے اجودھن کے باہر ایک ویران اور سنسان مقام چنا اور درختوں کے ایک جھرمٹ کے نیچے اپنے لیے ایک چھوٹا سا جھونپڑا بنایا۔ میلوں دور تک صرف ریتیلے ٹیلے اور ٹھگنے درخت تھے۔ وہ مقام جنگلی جانوروں اور سانپوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک بار خود بابا فرید کو ایک سانپ نے کاٹا اور ان کی والدہ صاحبہ کو کسی جنگلی جانور نے شہید کر ڈالا۔ کچھ عرصے تک بابا فرید نے اپنا سارا وقت عبادت میں گزارا لیکن پھر انھوں نے اپنے جھونپڑے کے دروازے آنے جانے والوں کے لیے کھول دیے۔ یہ عام بات ہے کہ جس کسی جگہ پر ولی اللہ بسیرا کرتے ہیں وہ جگہ ایک قسم کی مقناطیسی کشش حاصل کر لیتی ہے اور مریدوں، عقیدت مندوں اور چاہنے والوں کے ایک ہجوم کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور بہت جلد ایک چھوٹا سا شہر بس جاتا ہے۔ لہٰذا بہت زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ بابا فرید کے جھونپڑے کے پاس ایک خانقاہ اور جماعت خانہ تعمیر ہو گیا اور دور دور سے لوگ بابا فرید کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے حاضر ہونے لگے۔ بابا فرید کی نیک نامی اور عوام کے درمیان ان کی مقبولیت اجودھن کے قاضی کے حسد اور نفرت کا باعث بنی۔ قاضی نے مقامی جاگیرداروں اور سرکاری عہدہ داروں کو بابا کے خلاف بھڑکایا اور ان لوگوں نے بابا فرید اور ان کے اہل و عیال کو ستانا شروع کر دیا۔ قاضی اس حد تک پہنچ گیا کہ اس نے

بابا فرید کو شہید کرنے کے لیے ایک پیشہ ور قاتل کو آمادہ کیا۔ شیخ نظام الدین اولیاء بیان فرماتے ہیں کہ جب اس قاتل کو معلوم ہوا کہ بابا فرید کو اس کے ارادہ کی خبر ہوگئی ہے تو وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ قاضی نے پھر وہاں کے ولی (گورنر) سے شکایت کی کہ خانقاہ میں رہنے والے موسیقی اور اجتماعی حال وسماع جیسے "غیر اسلامی" فعل سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ چنانچہ ولی نے بابا فرید اور ان کے بیٹوں کے لیے زندگی دشوار کردی۔ لیکن بابا فرید نے ان سب مخالفتوں کا صبر اور تحمل سے سامنا کیا اور ان پر غالب ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس ولی کو نہ جانے کون سی بیماری ہوگئی اور وہ جلد ہی مرگیا۔

اجودھن میں گزارے ہوئے ان برسوں میں بابا فرید نے شادی کی اور ایک بڑے خاندان کی پرورش کی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی تین بیویاں تھیں جن میں سے ایک سلطان بلبن کی بیٹی تھیں۔ لیکن تاریخ میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ بابا فرید جو سلطان اور شاہی عہدہ داروں سے کسی قسم کی رسم و راہ نہیں رکھنا چاہتے تھے کبھی بھی ایک شہزادی سے بیاہ کرنے کو تیار نہیں ہوسکتے تھے۔ اور پھر اگر وہ سلطان کے داماد تھے تو وہ اس غریبی اور مفلسی میں کیسے رہ سکتے تھے۔ یہ صرف "جواہر فریدی" کے مصنف علی اصغر چشتی کی منصوبہ بند خیال آرائی کا نتیجہ ہے۔ "جواہر فریدی" کرامات اور غیر ممکن واقعات کے تذکروں سے بھری ہوئی غیر معتبر کتاب ہے۔ بابا فرید کے بہت سے بیٹے بیٹیاں اور بہت پوتے پوتیاں نواسے نواسیاں تھیں۔ لیکن صوفیوں کی مقررہ رسم کے مطابق جو کچھ بھی فتوح کے طور پر آتا تھا وہ سب غریبوں میں بانٹ دیا جاتا تھا۔ اس وجہ سے بابا فرید کے خاندان والوں کو غریبی اور بہت تنگی میں دن گزارنے پڑے۔ لیکن بابا فرید ان سب مصیبتوں سے بے اعتنا تھے اور انھیں خدا کی مرضی کے طور پر قبول کرکے اپنا زیادہ تر وقت عبادت اور روزہ میں گزارتے تھے۔

یہ بات کہ بابا فرید کی نیک نامی اور ان کا رسوخ دور دور تک پھیلا یوں ثابت ہوتی ہے کہ ان کے جماعت خانے کی کشش ہر معاشرت کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لاتی تھی۔ ان کے مریدوں کے علاوہ روحانیت کا یہ مرکز عالموں، تاجروں، افسروں اور معاشرے کے دیگر لوگوں کا مرکز بن گیا۔ یہ لوگ اپنی عام معاشرت یا تو کچھ عرصے کے لیے یا ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر سادگی کی زندگی گزارنے لگے تاکہ ان کی روحانی زندگی سنور سکے۔ تاریخ میں ایسے کئی نمایاں افراد کے نام درج ہیں جو انکسار کے ساتھ خدمت گزاری کے لیے آئے اور انھوں نے وہ چین اور سکون پایا جس کی انھیں ہمیشہ سے تمنا تھی۔

عوام کے درمیان بابا فرید کی بے پناہ مقبولیت کی کیا وجوہات تھیں؟ ولی اللہ تو ہر جگہ ہی ہر دل عزیز اور مقبول عام ہوتے ہیں۔ خاص طور پر جب ان کا تقدس اور ان کے روحانی کمالات تسلیم کر لیے جائیں۔ تب تو دیکھتے ہی دیکھتے ان کے مریدوں کی تعداد بے حساب ہو جاتی ہے۔ خصوصاً ہندوستان میں بزرگوں کے مقدس قول وعمل کی روایات پہاڑوں کے مانند پرانی ہیں۔ عام انسان دکھ، درد، پریشانی، مصیبت اور ان گنت طرح کی کشاکشوں کا شکار ہوتا ہے۔ وہ تسکین اور سہارے کی تلاش ہر طرف کرتا ہے اور اس کی خاطر ہر دروازے پر دستک دیتا ہے۔ دنیا کو اپنے دکھ درد سے بے اعتنا اور دنیاوی مشاغل کی دوڑ میں غرق پاکر وہ درویشوں اور بزرگوں کی طرف رخ کرتا ہے کیونکہ وہی وہ واحد لوگ ہیں جن کے پاس وقت ہے اور میلان ہے اور اس کے سوالات کے جواب بھی۔ کچھ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جن کا دل دنیا سے گھبرا چکا ہوتا ہے اور وہ دولت کے پیچھے دوڑنے کی فضولیت، دنیاوی شان وشوکت عیش وعزت کا کھوکھلا پن اور انسانی حیات کی بے ثباتی اور ناپائیداری کو خوب سمجھ چکے ہوتے ہیں اور سکون باطن اور روحانی رہنمائی چاہتے ہیں۔ آخر سنتوں اور سادھوؤں کی جائے قیام کے علاوہ وہ کس کا سہارا لے سکتے ہیں؟ بابا فرید چشتی سلسلے کے سربراہ کی حیثیت سے اور اپنی پارسائی، ریاضت اور عبادت، فراخ دلی اور غریبوں کے سربراہ کی مدد کرنے اور ان کے لیے دعا کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہنے کے باعث، اور سب سے بڑھ کر اپنے انکسار اور رحم دلی کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمان درویشوں میں سب سے زیادہ ہر دل عزیز بن گئے۔

بابا فرید عام لوگوں کی زبان یعنی ہندوی استعمال کرتے تھے۔ ہندوی جو کہ اردو اور ملتانی پنجابی کا سب سے ابتدائی روپ تھی، انھیں عام انسان کے قریب لانے کا ذریعہ بنی۔ علما اور دیگر عہدے دار تو اپنے سبھی کام کاج فارسی زبان میں کیا کرتے تھے۔ لیکن بابا فرید ان سے مختلف تھے۔ وہ اپنے سامعین سے اسی زبان میں مخاطب ہوا کرتے تھے جسے وہ بآسانی سمجھ سکیں اور جس سے وہ آشنا ہوں۔

بابا فرید پنجابی زبان کے بھی بہت بڑے شاعر تھے۔ شاید وہ سب سے پہلے شاعر تھے جنھوں نے روحانی جستجو کے گیت عام انسان کی روزمرہ بولی میں گائے۔ انھوں نے دیہاتی ماحول کے تشبیہات اور استعارے بھی استعمال کیے جس کی وجہ سے ان کے اشعار لوگوں میں بے حد مقبول ہوئے۔ ہم تصور کر سکتے ہیں کہ لوگ ان کے کلام کو مست ہو کر گاتے ہوں گے اور بے خود ہو جاتے ہوں گے۔ اس پر مستزاد قوالی اور غزلوں کا گانا اور مختلف موقعوں پر حال وسماع کی محفلیں، یہ سب مل کر وجد وحال کا ایسا ماحول پیدا کرتی تھیں جس میں مرشد، مرید اور شریک ہونے والے تمام اشخاص ایک ہو کر ہم نوع و متجانس مکمل

سے بن جاتے تھے۔ انھیں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک ہیں، اعتقاد میں اور روح میں بلا تفریق کے۔ یہ تھی انسانی برادری اور بھائی چارے کی روح اپنی انتہا پر پہنچتی ہوئی۔

بابا فرید بہت بڑے عالم اور اعلیٰ درجے کے معلم بھی تھے۔ دور دراز جگہوں سے علماء و فضلا ان سے دینی مسائل پر گفتگو کرنے کے لیے آتے تھے اور تصورات اور افکار کے اس تبادلے سے طمانیت قلب حاصل کرتے تھے۔ استاد کی حیثیت سے ان کے شاگردان کی بہت عزت کرتے تھے۔ اور زیادہ سے زیادہ لوگ ان کے پاس تصوف کے اسرار کا محرم ہونے کے لیے آتے تھے۔ غالب ہے کہ مریدوں اور شاگردوں کو تعلیم دیتے ہیں وہ بہت سختی برتتے ہوں گے لیکن ان کی خوبی یہ تھی کہ وہ جو کہتے تھے جس چیز کی تعلیم دیتے تھے، اس پر خود بھی پوری طرح عمل پیرا تھے۔

آخر میں یہ عرض کرنا لازمی ہے کہ بابا فرید نہ صرف یہ کہ خود کو ہندوستانی عوام کا جزو لاینفک سمجھتے تھے، بلکہ انھوں نے اسلامی تصوف کو ہندوستانی رنگ میں رنگ دیا۔ دوسرے ہندوستانی صوفیوں کی طرح انھوں نے بھی ویدانت، بدھ مذہب اور بھگتی تحریک سے بہت سی عناصر اخذ کیے۔ جوگیوں کی مثال پر عمل کرتے ہوئے صوفی بھی بے حد زہد نفس کشی سے کام لیتے تھے۔ بدھ مذہب کے ماننے والوں کی طرح وہ اپنا کھانا مانگ کر کھاتے تھے۔ بھگتی تحریک کی حمایت کرنے والوں کی طرح وہ بھی اپنے محبوب کے عشق میں وجد میں آکر رقص فرما اور نغمہ سرا ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ تمام مسلمان صوفیا نے عام لوگوں کی زبان اختیار کی اور اسے اپنے پیغام اور ذریعہ بنایا۔ بھگتی تحریک کے ماننے والوں کی طرح وہ ذات، مذہب یا نسل کو باعث تفریق نہیں سمجھتے تھے۔ اور ان کی آغوش ہر طرح کے، اور خاص کر نام نہاد نیچی ذات کے مرد عورتوں کے لیے کھلی ہوئی تھی۔ صوفیت اور بھگتی تحریک میں ایک اور مشابہت ہے۔ صوفی حضرات ازدواج کو سماجی دستور کی حیثیت سے قبول کرتے تھے۔ وہ شادی کرتے تھے اور اولاد بھی پیدا کرتے تھے۔ ان کے زہد اور غیر دنیاویت سے ترک دنیا یا کنارہ کشی مراد نہیں تھی۔ وہ اپنے ساتھی انسانوں کے دکھ درد سے بے اعتنا نہیں تھے۔ وہ خالق اور مخلوق دونوں کے عاشق تھے اور دونوں کی محبت ہی ان کی روحانی زندگی کی بنیاد تھی۔ اس کے علاوہ فلسفہ بگھار نے یا ذہنی موشگافی کی بہ نسبت طرز جبات کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ بھگتی تحریک کے مانند صوفیت کا بھی مقصد تیاگ اور بھگتی، دو بظاہر مختلف عناصر کو یکجا کرنا تھا۔ اور سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ انھوں نے ویدوں کے اس قدیم اصول کی توثیق کی کہ خدا کی ہستی میں انسان کو ضم ہو جانا چاہیے۔ یعنی زندگی کا مقصد ہے محدود کا لامحدود میں ضم ہو جانا۔ اور ان کا طریق، طریق عشق تھا اور ان کی نظر میں انسان کا انتہائی مقصود عشق الٰہی یا الوہی عشق کے مرادف تھا۔

بابا فرید کی زندگی کے آخری سال بے حد افلاس میں گزرے۔ یہ واضح کرنا مشکل ہے کہ عقیدت مندوں کی اس کثرت اور خلق اللہ میں اس قدر مقبولیت کے باوجود خانقاہ کے فتوح بند کیوں ہو گئے۔ ایسا لگتا ہے کہ آخری زمانے میں تو غذا کے نام پر گھر میں کچھ بھی نہیں تھا۔ لیکن ایسے حالات نے بھی انھیں روزہ، نماز اور ریاضت کے سخت معمول کو توڑنے نہیں دیا۔ ان کی وفات ۱۵ اکتوبر ۱۲۶۵ء کو ہوئی۔ وفات کے پہلے آپ نے تین بار نماز ادا کی اور آخری وقت پر یہ الفاظ ان کے لبوں پر تھے "یا حیُّ یا قیوم" اس طرح قرون وسطیٰ کے ایک عظیم ترین بزرگ اور ولی اللہ کی زندگی کا اختتام ہوا۔

بابا فرید کے ارشادات تین بنیادی اصولوں پر مبنی تھے: خدا سے محبت، پاکیزگی ذہن اور دنیاوی دولت اور ترقی سے بے تعلقی۔ خدا کی محبت مخلوق کی محبت کی طرف لے جاتی ہے۔ اور اس کا اظہار نرم دلی، خوش خلقی، سخاوت اور اعلیٰ ظرفی کے اعمال سے ہوتا ہے۔ جب ذہن پاکیزہ ہو جاتا ہے تب وہ انا، تکبر، غصہ، شہوت اور لالچ سے آزاد ہو جاتا ہے۔ پاکیزہ دماغ ذہن کو خارجی دنیا کی کشش سے دور کر کے سکون باطن کی تلاش کی طرف آمادہ کرتا ہے۔ روحانی کمال کی طرف یہ پہلا قدم ہے۔ بابا فرید نے خشیۃ اللہ کی کیفیت پر بہت اصرار کیا کیونکہ خوف خدا ہی انسانوں کو اپنے فعل کی اچھائی برائی کا احساس دلاتا ہے اور روز قیامت کی یاد تازہ رکھتا ہے۔ اس طرح وہ بالواسطہ اخلاقی زندگی کے لیے سہارا دینے والے پشتے کا کام کرتا ہے۔ اخلاقیت اور اخلاقی زندگی کے گہرے احساس کے بغیر روحانی زندگی کے آغاز کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ اخلاقیت کا اعلیٰ احساس اور سربت ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

بابا فرید نے غریبی کی زندگی گزارنے، دولت، دنیاوی خواہشات اور مادی بلند کوشی کو ٹھکرانے پر ہمیشہ اصرار کیا۔ فنا پذیر اور بے ثبات دنیا سے لگاؤ غم، مصیبت اور تکلیف اور کبھی نہ ختم ہونے والے الجھاؤوں کی طرف لے جاتا ہے جن سے موت کے علاوہ کوئی چھٹکارا نہیں ہے۔ بابا فرید نے ایک لمحے کے لیے بھی اس بات کو فراموش نہیں کیا کہ زندگی کا واحد مقصود آخری ہے اپنے معشوق سے اتصال یعنی وصول الی اللہ اور اسی لیے انھوں نے لوگوں کو راہ محبت سے آشنا کیا کیونکہ وہی وہ واحد راستہ ہے جو اس محبوب و مرغوب منزل تک پہنچاتا ہے۔ انھوں نے اپنے شاگردوں کو غربت کی زندگی قبول کرنا گناہوں سے توبہ کرنا اور غریبوں اور ضرورت مندوں کی خدمت کر کے خدا کے لیے اپنی محبت کا اظہار کرنا سکھایا بابا فرید نے کوئی فلسفہ نہیں بیان کیا۔ انھوں نے زندگی گزارنے کا طریقہ اور اطوار کے خاص قوانین پر زور دیا۔ اس کی شروعات شریعت کے اصولوں کی سختی سے پابندی سے ہوتی تھی اور پھر درجہ بہ درجہ بابا فرید مبتدیوں کو طریقت، معرفت اور آخر میں حقیقت کی طرف لے جاتے تھے۔ ہر منزل ایک درجہ تھا جس کے

اپنے مخصوص دستور العمل اور ریاضت کے سخت طریقے تھے جن پر عمل کرنا ضروری تھا۔ اس طرح بابا فرید مبتدیوں میں زندگی کی پاکیزگی اور سچائی اور لامحدود کی تلاش کا جوش پیدا کرتے تھے۔

بابا فرید اس بات پر زور دیتے تھے کہ خدا کے سامنے سبھی مخلوق برابری کا درجہ رکھتے ہیں خواہ وہ کسی بھی مذہب کے ماننے والے ہوں۔ فریدی لنگر کا قیام بھی ہر قسم کی تفریقوں کو دور کرنے کا ایک طریقہ تھا۔

بابا فرید کی ارشادات کا ایک اور پہلو ہے جس میں ایک طرح سے جدیدیت کا عنصر ہے۔ اگرچہ وہ زمانے سست رو اور فرصت سے بھرے ہوئے تھے، لیکن ان کی تعلیم یہ تھی کہ صوفی اور درویش کے پاس وقت ہی سب سے قیمتی سے ہے۔ زندگی بہت مختصر ہے اور صوفی کو بہت دور تک سفر کرنا ہے اس لیے جو بھی وقت اسے نصیب ہے اس کا اسے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ان کی خانقاہ میں اطوار کے قوانین سخت تھے اور ہر قسم کے فریضہ کی ادائیگی میں وقت کی سخت پابندگی کی جاتی تھی۔

بابا فرید نے ادائیگی زکوٰۃ کی قرآنی ہدایت پر بہت زور دیا۔ انسان کو اپنی آمدنی کا کچھ حصہ زکوٰۃ میں تقسیم کر دینا چاہیے۔ فیاضی کو ایک اعلیٰ خوبی سمجھا جاتا تھا اور فیاضی کی انتہا ہے کہ سب کچھ جو اپنے پاس ہے بانٹ دیا جائے۔ اس لیے کہ مال و متاع روحانی زندگی میں مخل ہوتے ہیں اور جتنا زیادہ کوئی بانٹتا ہے اتنا ہی بہتر انسان وہ بنتا ہے۔

بابا فرید نے اپنے مریدوں کو جو اطوار و آداب سکھائے اور جن پر خود عمل کیا، ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک عظیم الشان صوفی زندگی کی معنویت اور حکمت کو کس طرح سمجھتا ہے اور اسے اپنی زندگی میں مجسم کرتا ہے۔ سب سے بڑھ کر تو یہ تھا کہ بابا نے خود ان آداب و اطوار پر عمل کر کے انھیں ایک جیتی جاگتی حقیقت میں تبدیل کر دیا۔

تیسرا باب

فرید مسعود یا فرید ثانی

تاریخ مذاہب کے ایک بہت غیر معمولی اور حیرت انگیز واقعے نے بابا فرید کی تصانیف کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ بابا فرید عربی، فارسی اور کچھ مقامی ہندوستانی زبانوں جیسے اردو، ہندوی اور پنجابی میں اشعار کہتے تھے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ عربی، فارسی اور اردو کے صرف چند اشعار ہی ہم تک پہنچ سکے ہیں اور یہ بھی علمی تحقیق کرنے والوں کی نظروں میں غیر مستند ہیں۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے بابا فرید پر اپنی عمدہ کتاب، Life and Times of Fariduddin Ganj-i-Shakar میں تین کتابوں کا ذکر کیا ہے: (۱) "فوائد السالکین" یعنی ملفوظات شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ جسے بابا فرید کی تالیف بتایا جاتا ہے (۲) "اسرار الاولیاء" جو کہ بابا فرید کے ملفوظات پر مشتمل ہے اور شیخ بدرالدین اسحاق کی تالیف مانی جاتی ہے اور (۳) "راحت القلوب" جس کے بارے میں کہا جاتا

حضرت نظام الدین اولیاء کے تالیف کردہ ہیں۔ پروفیسر نظامی کا

ئ میں یہ کتابیں موضوع نظر آتی ہیں۔ اور بابا فرید کے سوانح حیات

جھا جا سکتا۔ بابا فرید کے خلفاء یا مریدوں میں سے کسی نے بھی ان

ا۔ لیکن ان کے پنجابی اشعار سینہ بہ سینہ، نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے

ہت بڑا مداح ملا۔ گورونانک نے ان اشعار کو اپنے تصانیف میں

بنے جانشین گورو انگد کو بطور ورثے منتقل کیا۔ اور جب ۱۶۰۴ میں

نے "آدی گرنتھ" کی تالیف کی تو وہ اشعار آدی گرنتھ میں "اشلوک

شامل کیے گئے" اور اس طرح انھیں بقائے دوام حاصل ہوئی اور

مانیف کی صورت میں متبرک ہو گئے۔

قدیم ترین سوانح حیات (جنھیں سکھ اصطلاح میں جنم ساکھی کہا جاتا ہے) کے مطابق گورو نانک (۱۴۶۹ - ۱۵۳۹) دو بار پاک پٹن تشریف لے گئے اور شیخ ابراہیم (جو کہ بابا فرید کے روحانی خلفا میں سے تھے) کے ساتھ روحانی معاملات پر تبادلۂ خیال کیا۔ اس بات چیت کے دوران شیخ ابراہیم بابا فرید کے اشعار بلند آواز میں پڑھا کرتے تھے۔ جب ہم ان اشعار کے مضمون پر غور کرتے ہیں تو ہمیں حقیقت اخروی کے ساتھ وصال کی شدید خواہش، انسانی زندگی کی فنا پذیری، دنیاوی اشیاء اور دولت کی بے ثباتی خدا کے لیے شدید پر جوش عشق، خدا کے حضور میں سب انسانوں کا یکساں ہونا، موت کی اہمیت، روز قیامت اور گناہوں کے لیے سزا، روحانی اور دنیاوی زندگی کا نامیاتی اتحاد اور اخلاقی خوبیاں پیدا کرنے کی باتیں ملتی ہیں۔ لہٰذا کوئی حیرت کی بات نہیں تھی کہ گورو نانک جو کہ خود کو نہ ہندو کہتے تھے نہ مسلمان سمجھتے تھے ان کو ان اشعار میں ایک روحانی ہم آہنگی ایک غیر معمولی بے تعصبی اور انسان دوستی کے جو احساسات ملے وہ انھیں اس قدر پسند آئے کہ انھوں نے وہ اشعار لکھوا کر آنے والی نسلوں کی بھلائی کی خاطر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیے۔

تقریباً تین سو سال تک کسی نے بھی اس بات پر کوئی شک نہیں کیا کہ ان اشعار کا مصنف بابا فرید کے علاوہ کوئی اور ہے۔ لیکن ایم اے میکالف نے سکھ مذہب کی اپنی ضخیم تاریخ میں بابا فرید کی حیات اور تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے مندرجہ ذیل جملہ لکھ کر ایک تنازعہ کی شروعات کی: "گورو نانک ۱۴۶۹ میں پیدا ہوئے تھے اس لیے ان کی ملاقات بابا فرید سے ذاتی طور پر ممکن نہیں تھی۔ گورو نانک کی سب سے پرانی جنم ساکھیوں میں بھی لکھا ہے کہ ان کی ملاقات شیخ برہم (ابراہیم) سے ہوئی تھی جو کہ بابا کے جانشین تھے اور فرید دوئم کے نام سے مشہور تھے۔ شیخ ابراہیم کے ساتھ ہی ان کی دو باضابطہ ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ اس بات کو پورے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ شیخ برہم نے وہ اشلوک اور دعائیں تصنیف کیں جو گرنتھ صاحب میں بابا فرید سے منسوب ہیں۔ انھوں نے غالباً اپنے سلسلے کے بانی کا نام بطور تخلص کے استعمال کیا ہے۔" اس کے بعد میکالف نے شیخ برہم (ابراہیم) کا مفصل نسب نامہ دیا ہے اور ہمیں بتایا ہے کہ ان کے دیگر خطابوں اور القاب میں فرید ثانی یا فرید دوئم بھی شامل ہیں۔

پچھلے پچاس برسوں میں پنجابی ادب کے علما اور مورخوں میں ان اشعار کے خالق کی شخصیت نزاع کا سبب بنی ہوئی ہے۔ ان اشلوکوں کے مصنف بابا فرید تھے یا فرید ثانی؟ دونوں طرف سر برآوردہ لوگوں کی رائیں ہیں۔ لہٰذا یہ لازمی ہو جاتا ہے کہ اس سوال کو ہم بھی تفصیل سے دیکھیں۔

پروفیسر نظامی اس بات کو مانتے ہیں کہ بابا فرید کو شاعری سے شغف تھا اور وہ اشعار

کہتے تھے۔ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ بابا فرید کا مقامی ملتانی زبان کی مقامی بولی میں کہا ہوا ایک شعر امیر خسرو نے "سیر الاولیاء" میں بطور حوالہ پیش کیا ہے۔ لیکن انھیں یہ بات ذرا پریشان کن لگتی ہے کہ نہ تو شیخ نظام الدین اولیاء نے اور نہ ہی بابا کے کسی اور جانشین نے کہیں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ بابا فرید نے اتنے بہت سے اشعار ملتانی میں کہے تھے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان اشلوکوں کی زبان کے لسانیاتی تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں جو محاورے اور اصطلاحات ملتی ہیں وہ بعد کے زمانے کی ہیں۔ یہ ملحوظ رہے کہ ان کا پہلا بیان منفی نوعیت کا ہے اور ان کا دوسرا دعویٰ بھی کسی مثال کے نہ ہونے کے باعث محتاج ثبوت ہے۔ پروفیسر نظامی کا یہ خیال تو ہے کہ ان اشلوکوں میں "شیخ فرید کے وہ ارشادات ہیں جو روایتوں میں ملتے ہیں" لیکن وہ آخر میں اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ اشلوک شیخ ابراہیم کی تصنیف ہیں جو کہ غالباً گورو نانک کے ہم عصر تھے۔

حال ہی شائع شدہ کتاب "پنجابی صوفی شعراء" (Punjabi Sufi Poets) کی مصنفہ لاجونتی راما کرشنا نے میکالف کے نتائج کی توثیق کرتے ہوئے مندرجہ ذیل اشلوک سے بھی اس کی تصدیق کی ہے:

اے شیخ اس دنیا میں کوئی بھی حیات پائیدار نہیں ہے
آج یہ جو میری جگہ ہے وہ مجھ سے پہلے بہتوں کی تھی۔

وہ آگے لکھتی ہیں کہ "مندرجہ بالا اشلوک سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے مصنف بابا فرید الدین نہیں تھے بلکہ ان کا کوئی وارث جو کہ ان کا جانشین تھا، یعنی فرید دوئم۔ یہ نتیجہ بہت حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے۔ اس اشلوک میں محض زندگی کی فنا پذیری کا ذکر ہے اور اس میں یہ کہا گیا ہے کہ شیخ فرید کے اجداد بھی دنیا کو چھوڑ گئے تھے۔ خود بابا فرید کے دو روحانی اجداد تھے۔ خواجہ بختیار کاکی اور خواجہ معین الدین چشتی۔ اور بابا فرید کا جسمانی سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروق سے ملتا ہے۔ لاجونتی راما کرشنا کی رائے کے ساتھ اتفاق کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ اتنا اہم مسئلہ صرف ایک اشلوک کی تشریح کر کے، اور وہ بھی ہمارے خیال میں غلط تشریح کر کے، طے نہیں کیا جا سکتا۔

ان اشعار کی تخلیق کے بارے میں میکالف کا تجزیہ بھی نامکمل ہے۔ یہ تو کوئی دلیل نہیں ہے کہ چونکہ گورو نانک (۱۵۳۹ - ۱۴۶۹) اور بابا فرید (۱۲۶۵ - ۱۱۷۳) ہم عصر نہیں تھے اور محض اس لیے کہ گورو نانک کی شیخ ابراہیم سے ملاقات ہوئی (۱۵۵۲) اس لیے وہ اشعار بلاشبہ شیخ ابراہیم کے ہیں۔ یہ تو صریحاً غیر منطقی بات ہے۔ دوسرے میکالف کے مطابق "شیخ برہم (ابراہیم) عظیم اولیاء اللہ کی

فہرست میں ایک نمایاں مقام کے مالک ہیں۔ انھیں بہت سے لقب دیئے گئے ہیں جیسے فرید ثانی یا فرید دوئم، ثالث فرید یا فرید فیصلہ کن، شیخ برہم کلاں، بال راجا، شیخ برہم صاحب اور شاہ برہم۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ ایسے اونچے اونچے خطابوں والے شخص کا صوفیت کی ادبی تاریخ یا پنجابی زبان کے مسلمان شعراء کے قلمی آثار میں کوئی ذکر نہیں ہے جب کہ فرید گنج شکر کو بحیثیت شاعر اور ولی اللہ کے بے انتہا خراج عقیدت پیش کیے گئے ہیں۔ میکالف نے حسب معمول شیخ برہم کی عظمت کی دلیل کے طور پر ان کی کرامتوں کے ذکر کو دہرایا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ بابا فرید کی زندگی کے متعلق میکالف کا پورا تذکرہ کرامتوں پر زیادہ زور دینے کی خامی کے باعث فاسد ہوگیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسے غیر معترض اور سریع الاعتقاد مصنف تھے کہ جو کچھ معلومات انھیں دی گئیں انھوں نے فوراً سب پر یقین کر لیا اور اپنی کتاب " کے اوراق ان سے بھر ڈالے۔"

پھر تخلص کا خیال بھی خود میکالف کا ایجاد کردہ ہے۔ پروفیسر نظامی نے ہمیں بابا فرید کے سات روحانی جانشینوں کے نام دیئے ہیں اور بابا فرید کی خانقاہ کے پچیس سجادہ نشینوں کے بھی نام دیئے ہیں لیکن ان میں سے کسی نے بھی "فرید" کا تخلص نہیں استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ سکھ گوروؤں کے برخلاف صوفی حضرات اپنے پیر کا نام بطور تخلص استعمال نہیں کرتے۔

میکالف نے اس چھتیس برس کی مدت ریاضت کا بھی ذکر کیا ہے جو بابا فرید نے جنگل میں گزاری تھی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب بابا فرید نے ریاضت کے دوسرے دور کا آغاز کیا جس کی مدت بارہ برس کی تھی تب" انھوں نے روٹی نما ایک لکڑی کا ٹکڑا اپنے پیٹ پر باندھ لیا، تاکہ کسی بھی جاندار شے کو چوٹ نہ لگے، اور کہا جاتا ہے کہ اسی خیالی روٹی کی خیالی غذا نے انھیں اس ریاضت کی پوری مدت تک زندہ رکھا.... ایک دن شدید بھوک کی حالت میں، یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اس لکڑی کے ٹکڑے کو اپنی بھوک مٹانے کی امید سے چبانا چاہا۔ ان کے دانت کے نشان اس لکڑی کے ٹکڑے پر ابھی تک موجود ہیں اور یہ لکڑی پاک پٹن میں محفوظ رکھی ہوئی ہے۔" میکالف بابا فرید کے اشلوکوں کا ترجمہ کرتے وقت اشلوکوں کے متن کو بابا کی زندگی کے واقعات سے جوڑنا بھول گئے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشلوک اوپر ذکر کیے گئے واقعہ کا براہ راست اور ناقابل تردید حوالہ دیتا ہے:

فرید میری روٹی لکڑی کی بنی ہے اور بھوک میری چٹنی ہے
وہ جو مکھن لگی روٹی کھاتے ہیں بہت درد اٹھائیں گے (۲۸)

میکالف آگے لکھتے ہیں کہ بارہ سالہ ریاضت کے تیسرے دور میں "بابا فرید خود کو کنوئیں میں

الٹا لٹکواتے تھے"۔ یہی ہے وہ چلۂ معکوس جس کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔ جب وہ اس صورت حال میں تھے تب "چڑیاں ان کے بالوں میں اپنا گھونسلا بنا لیتی تھیں اور گوشت خور جانور ان کے جسم کو نوچتے یا کھاتے تھے"۔ اس ریاضت کے ثبوت میں میکالف اس اشلوک کا حوالہ دیتے ہیں:

فرید تیرا جسم سولی پر لٹکا ہے، تیرا سر
پنجر بن گیا ہے، کوے تیرے پاؤں پر چونچ مارتے ہیں

یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ مندرجہ بالا اشلوک بابا فرید کی تصنیف ہے، میکالف اب اس پر ایک عجیب فقرہ متزاد کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "یہ اشلوک بعد میں بڑھا کر شیخ برہم کے نمبر ۹۰، نمبر ۹۱، اور نمبر ۹۲ اشلوکوں میں تبدیل ہو گیا"۔ چلئے ان اشلوکوں پر سرسری نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ ان کا بابا فرید کی حیات اور شاعری سے کیا رشتہ تھا:

فرید میرا سوکھا ہوا جسم ہڈی کا ڈھانچہ بن گیا ہے
کوے میری ہتھیلی اور تلوؤں پر چونچ مارتے ہیں
ابھی تک اللہ تعالیٰ میری مدد کو نہیں آئے
اللہ کے اس بندے کی بدقسمتی تو دیکھو

(نمبر ۹۰)

اے کوؤں تم نے اس ہڈی کے ڈھانچے کو ڈھونڈ ڈالا جو کہ میرا جسم ہے
اور میرا سب گوشت کھا لیا۔
لیکن ان دو آنکھوں کو مت چھونا، کیونکہ مجھے ابھی
دیدار محبوب کی آس ہے۔

(نمبر ۹۱)

اے کوؤں میرے ہڈی نما جسم پر مت چونچ مارو، اگر اتفاق سے
تم اس پر بیٹھ بھی جاؤ تو فوراً اڑ جانا۔
کسی بھی حال میں وہ گوشت مت کھاؤ جہاں میرا مالک
میرے ڈھانچے میں رہتا ہے (نمبر ۹۲)

میکالف نے یہ نہیں بتایا ہے کہ چلۂ معکوس کے بارے میں جس اشلوک کا ترجمہ انھوں نے کیا ہے وہ گرنتھ صاحب میں نہیں ہے، بلکہ اس کی جگہ پر ۹۰، ۹۱، اور ۹۲ شامل ہیں۔ یہ چاروں اشلوک

بابا فرید کی زندگی کے ایک ہی واقع متعلق ہیں۔ ریاضت کی انتہا میں انھوں نے اپنے کو الٹا لٹکا لیا ہے، ان کا جسم ایک ڈھانچہ بن گیا ہے، چڑیوں نے ان کے بالوں میں گھونسلے بنائے ہیں اور کوے ان کے بدن پر چونچ مارتے ہیں۔ پہلے اشلوک میں وہ افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ اتنی ریاضت اور اتنی تکلیف سہنے کے باوجود اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی مدد کو نہیں آیا ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ کیا انھیں اس سے بھی بڑھ کر اذیت اٹھانی ہوگی۔ اشلوک ۹۰ اسی موضوع کو دہراتا ہے۔ یہ اشلوک پہلے والے کا تھوڑا سا بدلا ہوا چربہ ہے۔ (اور یہ گرنتھ صاحب میں شامل نہیں ہے) ہو سکتا ہے کہ بابا فرید کے اشلوکوں میں یہ ترمیم زبانی ترسیل کے دوران ہوئی ہو۔ لیکن اشلوک ۹۱ اور ۹۲ اسی موضوع کا تسلسل ہیں: اب اظہار مایوسی کے بجائے اظہار امید ہے۔ فرید کوؤں سے التجا کرتے ہیں کہ ان کی آنکھوں پر چونچ نہ ماریں کیونکہ انھیں وصول الی اللہ کا پورا یقین ہے اور یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ان کا جسم ڈھانچے میں بدل گیا ہے اور ان کے بدن کے ٹکڑے ہو گئے ہیں لیکن ان کا اندرونی جذبہ زندہ ہے۔ وصل خدا حاصل کرنے کا یقین پکا اور لازوال ہے۔ آخری اشلوک (یعنی ۹۳) میں فرید کوئے سے التجا کرتے ہیں کہ وہ ان کے دل کو نہ چھوئے کیونکہ وہ خدا کا گھر ہے۔ یہی اس کا مندر ہے اور اسے محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ جب وہ اپنی آنکھوں کو بچانے کی التجا کرتے ہیں تب انھیں خدا کو "سگن" صورت میں (یعنی ظاہری صفات کے ساتھ) دیکھنے کی امید ہے اور جس خدا کو وہ اپنے دل میں عزیز رکھتے ہیں وہ "نرگن" ہے (یعنی اس میں ظاہری صفات نہیں ہیں)۔ چاروں اشلوک ایک ہی تجربے کے احساس سے متعلق ہیں اور زبان اور انداز بیان بھی یکساں ہے۔ مصنف کی شخصیت بالکل صاف سامنے آتی ہے۔ متکلم اور شاعر صریحاً ایک ہی شخص ہے۔

یہ بات بھی قابل حیرت ہے کہ ایک طرف تو میکالف یہ مانتے ہیں کہ وہ اشلوک جو لکڑی کی روٹی اور چلۂ معکوس کے بارے میں ہیں وہ بابا فرید گنج شکر کے ہیں اور ان کے ذاتی تجربات پر منحصر ہیں لیکن پھر آگے چل کر وہ یہ کہتے ہیں کہ اشلوک ۹۱، ۹۲ اور ۹۳ فرید دوئم نے لکھے تھے۔ وہ یہ واضح کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ وہ اس نتیجہ پر کیسے پہنچے، جب کہ داخلی ثبوت یعنی سوانحی تفصیلات اور لسانی صفات دونوں ہی نقطۂ نظر سے ان اشلوکوں کے خالق بابا فرید ہی ثابت ہوتے ہیں

اس مناقشے سے متعلق ایک اور نکتہ ہے جس کے بارے میں سوچنا ضروری ہے۔ بابا فرید کے عربی، فارسی، ہندوی اور پنجابی تصانیف جو ہمارے سامنے ہیں ان سے صاف ثابت ہے کہ وہ شاعر

تھے۔ ہندوستان میں متصوفانہ فکر کی نشوونما پر تحقیقی کام کرنے والے علمار نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔ چشتی سلسلے کے صوفیوں نے ہمیشہ بابا فرید کے اشعار کو گایا ہے اور ان کی کلام کی روایتیں بخوبی قائم ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ شیخ برہم کے پیدا ہونے سے ڈیڑھ سو برس پہلے لکھی جانے والی کتاب "سیرالاولیار" میں بابا فرید کے ایک پنجابی شعر کا مل جانا یہ ثابت کرتا ہے کہ ایسے اشعار شیخ برہم کے زمانے کے پہلے کے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ فارسی زبان کی بڑھتی ہوئی اہمیت کے پیش نظر بابا فرید کے پنجابی اشعار نسبتہً غیر اہم ٹھہرے اور گاؤں والوں ہی کا دل بہلانے اور صلاح و فلاح دینے والی تصانیف کی حیثیت سے ہی مقبول رہے۔ ان اشعار کی صحیح قدر اس وقت تک کسی نے نہیں پہچانی جب تک وہ گورو گرنتھ صاحب میں شامل نہیں ہو گئے۔ یہ سب دلائل یہ ثابت کرتے ہیں کہ بابا فرید دیگر زبانوں کے علاوہ پنجابی زبان کے شاعر تھے۔ لیکن کیا کہیں کوئی روایت ایسی بھی ہے کہ فرید ثانی شاعری کرتے تھے؟ چشتی سلسلہ فرید ثانی کے شاعر ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا اور نہ ہی میکالف کے اس دعوے کا کوئی دستاویزی ثبوت موجود ہے کہ فرید ثانی ہی وہ شاعر تھے جنھوں نے وہ اشعار لکھے جو آج بابا فرید سے منسوب ہیں۔ ان باتوں میں ایک مزید اضافہ یہ بھی کیا جانا چاہیئے کہ جس قسم کی صوفی شاعری کی روایت بابا فرید نے قائم کی وہ ان کے بعد تقریباً تین سو سال تک زندہ رہی۔ وارث شاہ جیسے بلند پایہ شاعروں نے بابا فرید کو خراج عقیدت پیش کیے اور انھیں صوفی شاعروں میں سب سے اول سمجھا۔ لیکن کسی نے بھی نہ فرید ثانی کا نام لیا ہے نہ ان کی تصانیف کا ذکر کیا ہے۔ آج بھی اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ پر اور دلّی میں حضرت نظام الدین اولیار کی درگاہ پر فرید گنج شکر کے اشعار گائے جاتے ہیں لیکن فرید ثانی کے گیتوں کا ذکر تک کسی نے نہیں سنا۔

کچھ نقادوں کا خیال ہے کہ چونکہ فرید عربی اور فارسی علوم میں مستغرق تھے اس لیے وہ اشلوکوں کی پر تخیل اور لطیف زبان میں اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں شک ہے کہ بابا فرید کو پنجابی پر اتنی مہارت کیوں کر ہو سکتی تھی جب کہ دربار اور شرفار کی زبان فارسی تھی؟ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ فرید کے دادا ان کی پیدائش کے پچاس برس قبل ہندوستان آئے تھے اور بابا فرید نے اپنی تعلیم کھوتوال اور ملتان میں حاصل کی اور پنجاب میں نوے برس گزارے۔ لہٰذا یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ انھیں عام لوگوں کی زبان آتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک صوفی کی حیثیت سے ان کی گفتگو عوام سے تھی۔ انھوں نے اپنے کو درباروں اور سلاطین سے دور رکھا اور اپنے پیغام تبلیغ و تربیت روحانی

کے لیے انھوں نے لامحالہ پنجابی کی ملتانی بولی کا استعمال کیا۔ اور ان کے اندر جو شاعر تھا اس نے فطرتاً خود کو اپنے بچپن اور جوانی کی زبان میں ظاہر کیا اور اپنے ماحول سے تشبیہات اور استعارات اخذ کر کے استعمال کیے۔

یہ بہرحال ممکن ہے کہ سالہا سال کے دوران جب یہ اشلوک زبانی ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوئے تو ان کی زبان شاید کچھ معتدل ہو گئی ہو یا انداز بیان میں کچھ ترمیم ہوئی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تین سو برس کے دوران کچھ نئے اشلوک شامل ہو گئے ہوں یا کچھ پرانے اشلوکوں میں ردوبدل ہوا ہو۔ اور جب ان اشلوکوں کو لکھنے کی نوبت آئی تو شاید ان میں کچھ اور ترمیم کی گئی ہو اور روزمرہ اور محاورہ کی رو سے انھیں جدید تر کر دیا گیا ہو۔ لیکن ان سب اشلوکوں میں انداز بیان، مضامین، اسلوب ایک سا ہی رہا۔ ان میں بابا فرید ہی کا دل دھڑکتا ہے اور روحانی تلاش کی وہی منزل اور وہی مقصود ان میں بیان ہوا ہے جو بابا فرید کا مابہ الامتیاز تھا۔ زیادہ تر اشلوکوں میں ملتانی الفاظ کا فارسی اور عربی اسلوبوں کے ساتھ وہی مرکب نظر آتا ہے۔ یہ واضح ہے کہ ان کی دھنیں مقامی عوامی موسیقی سے ماخوذ ہیں اور تشبیہات دیہاتی طرز زندگی سے ماخوذ ہیں۔ زیادہ تر اشلوک ملتان اور منٹگمری کے لوگوں کی مذہبی اور تہذیبی طرز حیات سے متعلق ہیں۔ جب ہم بابا فرید کی زندگی کے تفصیلات کا گہرائی سے مطالعہ کرتے ہیں اور بہت سارے اشلوکوں کے مضمون سے ان کی مشابہت دیکھتے ہیں تو ہم لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ اشلوک بابا فرید گنج شکر نے لکھے تھے۔

آخر میں ان اشلوکوں کے متعلق مناقشے کو ایک اور زاویے سے دیکھیں، یعنی ارجن دیو کا ان اشلوکوں کو گرنتھ صاحب میں شامل کرنا۔ یہ سکھ گوروؤں کی بے تعصبی اور آزاد منشی کی دلیل ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب مقدس میں ایک مسلمان ولی اللہ کی تحریریں شامل کیں۔ انھوں نے ان اشلوکوں کو متبرک کیا اور انھیں ''گورو بانی'' (یعنی گوروؤں کی مقدس تصانیف) کا درجہ دیا جس کی وجہ سے ان کا اسی احترام سے مطالعہ ہوتا ہے جیسے گوروؤں کی تصانیف کا۔ اور ان کا اور بابا نانک کے پہلے آنے والے بارہ دیگر ''بھگتوں'' کی تصانیف کا گرنتھ صاحب میں شامل ہونا اس باعث تھا کہ یہ سب حضرات روحانی طرز زندگی کے ان پہلوؤں پر زور دیتے تھے جنھیں سکھوں میں دلنشیں کرانا سکھ گوروؤں کا مقصد ہے۔

بابا فرید کے چار ''شبد'' اور ایک سو چودہ ''اشلوک'' گورو گرنتھ صاحب میں شامل ہیں۔ دراصل ''اشلوک شیخ فرید کے'' کے عنوان میں ایک سو تیس اشلوک ہیں لیکن ان میں اٹھارہ اشلوک دوسرے گوروؤں کے ہیں جو بابا فرید کے اشلوکوں پر متزاد ہیں یا تفصیل کا کام کرتے ہیں۔ یہاں پر یہ بتانا بھی

ضروری ہے کہ پنجابی زبان میں کہے گئے بابا فرید کے سبھی اشلوک گرنتھ صاحب میں شامل نہیں ہیں۔ گورو ارجن دیو نے "بھگتوں" میں سے کسی کے بھی پورے کلام کو گرنتھ صاحب میں شامل نہیں کیا۔ ان کا مزاج بہت انتخابی تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس باب میں بھی پوری طرح مطمئن ہونا چاہتے تھے کہ جو اشلوک شامل کیے جائیں وہ انھیں لوگوں کے ہوں جن سے وہ منسوب ہیں۔ یہاں تک کہ سکھ مذہب کے بانی گورو نانک بابا کے بھی کچھ اشلوک شامل نہیں کیے گئے ہیں۔ "بھگتوں" میں سے بھی انھوں نے صرف چند کا انتخاب کیا اور بھگتی تحریک کے کچھ بہت اہم "بھگتوں" مثلاً تلسی داس، میرابائی وغیرہ کے تصانیف کو گرنتھ صاحب میں شامل نہیں کیا۔

گرنتھ صاحب کی تالیف کے وقت گورو ارجن دیو کو پوری طرح معلوم تھا کہ وہ شیخ ابراہیم ہی تھے جن سے گورو نانک بابا کی ملاقات پاک پٹن میں ہوئی تھی۔ گورو ارجن دیو گورو نانک کی سیاحت کی تفصیلات سے بھی واقف تھے۔ یہ تفصیلات دوسرے گورو یعنی گورو انگد دیو کی تالیف کردہ "جنم ساکھی" میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس جنم ساکھی کی تالیف میں ان کی مدد بابا بدھا نے کی۔ بابا بدھا کے گورو نانک سے ذاتی مراسم تھے اور ان کی زندگی کے ہر واقعے سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ اس کے علاوہ جن محرروں کو گورو ارجن دیو نے اس کام کے لیے چنا، مثلاً بھائی گرداس، بھائی سنت رام، بھائی ہریا اور بھائی سکھا یہ بھی مشہور عالم تھے، وہ "گربانی" کا گہرا مطالعہ کر چکے تھے اور وہ اس میں کسی غلطی کو روا نہ رکھ سکتے تھے۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ گورو گرنتھ صاحب میں ہر ٹکڑے کے مصنف کا نام صاف صاف دیا ہوا ہے۔ اگر فرید ثانی ان میں سے کسی بھی اشلوک کے مصنف ہوتے تو گورو ارجن دیو کے لیے نام دینا کوئی مشکل نہ ہوتا۔ گورو ارجن دیو خود اعلیٰ درجے کے شاعر اور عالم تھے اور وہ "بھگتوں" کی شامل کردہ تصانیف میں کسی قسم کا ابہام کیوں منظور کرتے۔ انھوں نے گرنتھ صاحب کی تالیف کا کام بے حد ذمہ داری کے ساتھ اپنے اوپر لیا تھا۔ انھوں نے ہر ممکن موجود ماخذ کا استعمال کیا تاکہ متن کی صحت برقرار رہے اور "بانی" کے ان مصنفوں کا نام جن کی تصانیف گرنتھ میں شامل کرنے کے لائق سمجھی گئیں، بھی صحیح ہو۔ جب ان کے مرتبے کا سنت نما عالم بابا فرید گنج شکر کو ان اشلوکوں کا مصنف تسلیم کرتا ہے تو پھر اس قسم کے مناقشے کی کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔

اس بحث کا اختتام ہم ان الفاظ سے کرنا چاہیں گے کہ اب وقت آگیا ہے کہ اس مناقشے کو زیر زمین ڈال دیا جائے اور پھر کبھی اٹھایا نہ جائے۔

چوتھا باب

فرید بحیثیت شاعر شریعت اسلامیہ

اسلامی سریت کو تصوف کہتے ہیں۔ تصوف کی بنیاد شریعت پر ہے اور اپنے آغاز کے دور سے ہی تصوف نے قرآنی ہدایات مثلاً نماز، روزہ، حج اور دیگر مذہبی مناسک و آداب پر اصرار کیا۔ تصوف قرآن وحدیث کے مطالعے کی تلقین بھی کرتا تھا۔ اس کی نشو نما کے دوران اس پر ایران اور ہندوستانی طرز فکر کا اثر ہوا اور اس نے ہندوستانی علینیت کے کچھ عنصر اخذ کیے۔ صوفیت کا سب سے نمایاں عقیدہ تھا وصول الی اللہ۔ جیسا پہلے بیان کیا جا چکا ہے، شروع کے صوفی ریاضت کش تھے اور خود اپنی رضا سے دولت اور دنیاوی ترقی ترک کرتے تھے۔ صوفیت نے قرون وسطیٰ کے جاگیردارانہ نظام اور اس سے پیوستہ شان وشوکت اور عیاشی کی بھی سخت مخالفت کی۔ صوفیوں کا خیال تھا کہ سادگی اور انسانی بھائی چارے کی قرآنی ہدایات پر عمل ہونا بند ہو گیا ہے۔ لہٰذا اس کے رد عمل میں انھوں نے سلطانوں اور بادشاہوں سے منہ موڑ لیا اور دنیا سے کنارہ کشی اختیار کی تاکہ وہ اپنی زندگی روحانی ترقی حاصل کرنے میں صرف کر سکیں۔ صوفیوں کا عقیدہ تھا کہ وصول الی اللہ کا ذریعہ صرف عشق ہے۔ اسے وہ "طریقت" یعنی "طریق عشق" کہتے تھے۔ صوفیت کا جوہر یہ ہے کہ اللہ کی ذات کا شعور وجد کی کیفیت کے ساتھ حاصل ہو۔ اس کے علاوہ صوفیوں نے اس اعتقاد کی توثیق کی کہ صوفی اپنی ہستی اور خدا کی ہستی میں یگانگت حاصل کر سکتا ہے۔ (اس عقیدے کو وحدت الوجود کہا جاتا تھا یعنی۔ وجود کی وحدت) صوفی لوگ موسیقی کو اسی لیے استعمال کرتے تھے تاکہ جذباتی تلاطم اور وجد کی حالت پیدا ہو۔ تصوف کی تبلیغ کے لیے ایران میں بہت سے سلسلے قائم ہوئے۔ بہت سے سلاسل تاریخی حالات کے دباؤ کی وجہ سے ہندوستان بھی پہونچے۔

ہمیں بابا فرید کی شاعری کا مطالعہ اس پس منظر میں کرنا چاہیے۔ بابا فرید جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں

پنجابی زبان کے سب سے پہلے شاعر تھے۔ عربی اور فارسی لیاقت' جاندار قوت تخیل اور گہری زود حسی کی بنا پر انھوں نے اس غیر ترقی یافتہ تقریباً دیہاتی مقامی زبان کو بالکل بدل ڈالا اور اسے انسان کے عمیق ترین جذبات اور محسوسات کے بیان کے قابل بنا دیا۔ فرید سب سے پہلے صوفی شاعر تھے۔ جب ان پر کیف کا عالم طاری ہوتا تو وہ پنجابی میں شعر کہتے' ان کے اشعار ایسے درد دل کا اظہار کرتے تھے جو عشق الٰہی سے بھرا ہوا تھا۔ بحیثیت چشتی سلسلے کے سربراہ کے بابا فرید تصوف کے عقیدوں پر عمل کرتے تھے، لوگوں کو ان کی تعلیم دیتے تھے۔ بحیثیت شاعر انھیں ایسی زبان اور محاورے کی نشو نما کرنی تھی جس میں وہ تصوف کے باریک و لطیف تصورات بیان کر سکیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی زبان کا عام فہم بھی ہونا ضروری تھا کیونکہ صوفیوں کا تخاطب خواص سے نہیں بلکہ عوام سے تھا۔ یہ قدرتی بات ہے کہ بابا فرید نے ملتانی پنجابی جو کہ ان کے بچپن کی زبان تھی کو چنا اور لوگوں کو دنیاوی داؤ پیچ سے دور کر کے خدا ترس بنانے کے لیے انھوں نے دیہات کی زندگی سے تشبیہات اور استعارات اخذ کیے اور استعمال کیے۔

انسانی زندگی اپنی نوعیت کے اعتبار سے دُکھ، غم، تکلیف اور ناکامیوں سے بھری ہوئی ہے۔ بچپن، جوانی اور بڑھاپا اس کے مختلف مدارج ہیں۔ ان کا اختتام موت ہے۔ انسان تناؤ سے دور رہنا چاہتا ہے اور بیماریوں اور ان کے ساتھ منسلک تکلیفوں اور اذیتوں سے بچنا چاہتا ہے۔ وہ بڑھاپے، قویٰ کے اضمحلال، جسمانی لذات کے زوال، ہمیشہ بڑھنے والی پابندیاں اور کبھی نہ ختم ہونے والی تکلیفوں سے نفرت کرتا ہے۔ اور موت سب سے پر اسرار، اور ڈراؤنا واقعہ ہے۔ انسان کو معلوم ہے کہ ہر زندگی کا اختتام موت ہے اور موت سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ لیکن موت کی نوعیت کیا ہے اور موت کے بعد کیا ہوتا ہے یہ ایسے سوالات ہیں جن کا کوئی جواب نہیں ہے۔ دکھ اور اذیت سے بچنے کے لیے آدمی پیروں اور بزرگوں کا سہارا لیتا ہے اور ان سے عبادت کرنا سیکھتا ہے۔ عبادت اور دعا اسے کچھ اطمینان اور سکون ضرور پہنچاتی ہے لیکن بہت جلد ہی عبادت اور دعا بھی معمول بن جاتی ہیں۔ رسمی عبادت سے سکون باطن نہیں مل پاتا۔ ایسی منزل پر پہنچ کر حساس طبائع تصوف کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور ظاہری دنیا کو مسترد کرتے ہوئے باطن کا رخ کرتے ہیں۔ بابا فرید انسانی حیات کی ان کمیوں سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے اپنے اشعار میں زندگی کی ناپائیداری، موت کی تباہ کاریاں، رنج، غم، دنیاوی زندگی کی بے وقعتی اور مختصر زندگی جو انسان کو ملی ہے، جیسے مضامین کو بار بار برتا۔ موت کی یہ مستقل یاد آوری بلاشبہ انسانی زندگی کی المناک بربادی کے احساس کو روشن کرتی ہے۔ لیکن

اس احساس الم کو متوازن کرنے کے لیے بابا فرید نے عشق الٰہی کا بھی ذکر بار بار کیا اور اس طرح انسانی تقدیر میں ایک امید کی کرن رکھی۔ ایک طرف وہ تیاگ اور زہد کا ذکر کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ خدا کی مخلوق کا سکھ دکھ میں ساتھ دینے پر اصرار کرتے ہیں۔ تارک لذات کی حیثیت سے وہ زندگی میں سادگی اور جفاکشی کے گیت گاتے ہیں اور سچائی، عفو، گناہ سے احتراز جیسی اخلاقی خوبیوں پر زور دیتے ہیں۔ لیکن ان کے دل کی عمیق ترین جذباتی لہریں انھیں روحانی عشق کے گیت گانے اور عشق کو وصول الی اللہ کا واحد ذریعہ بتانے پر مجبور کرتی ہیں۔ جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا، بابا فرید وصول کی انتہائی منزل تک نہیں جاتے۔ یعنی اس منزل تک جسے حضرت منصور حلاج نے "انا الحق" کا دعویٰ کرکے ظاہر کیا تھا۔ "انا الحق" وہ منزل ہے جہاں جنت کی خواہش اور دوزخ کا ڈر کچھ بھی نہیں ہوتا، عبادت اور دیگر ظاہری رسوم ترک کر دئے جاتے ہیں اور انھیں بے معنی سمجھا جاتا ہے اور جہاں عشق کا جذبہ بے پناہ وجد اور فراموشی کی اس منزل پر پہنچتا ہے جس کا اظہار بلھے شاہ کی شاعری میں ہوا ہے۔ لیکن پھر بھی روحانی عاشق کے لیے فرید کا جذبہ شدید اور پختہ ہے اور اس کا اظہار ناقابل تقلید اور دل کو چھو لینے والے ادراک سے بھرے ہوئے اشعار میں ہوا ہے۔ روحانی معشوق سے جدائی اور اس سے ملنے کی آرزو کے جذبات کی نغمہ سرائی عشق مجازی کی اصطلاحوں میں ہوئی ہے۔ ان کی شاعری میں لازوال تازگی کی صفت ہے۔

پنجابی زبان میں صوفی شاعری ارتقا کی تین منزلوں سے گزری۔ پہلی منزل کی نمائندہ بابا فرید کی شاعری ہے جس میں شریعت کو مقدس سمجھا گیا ہے اور اسے سب سے اہم اور اصل روحانی تجربے کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ فرید اسلامی طرز حیات اور اس میں خدا کی وحدت اور انسانی بھائی چارے کے عقیدے پر جو زور دیا گیا ہے، ان سب کے گیت گاتے ہیں۔ وہ اسلامی طرز حیات کے بھی اتنے ہی بڑے مبلغ ہیں جتنے صوفیت کے۔ دوسری منزل کی نمائندگی شاہ حسین کرتے ہیں جو شریعت کو قبول تو کرتے ہیں لیکن اصول شریعت کو کم وبیش نظرانداز کرتے ہیں۔ وہ ہندوستانی فکر اور رواج سے زیادہ ہم آہنگ تھے اور "کرم" اور "سمسار" (یعنی پیدائش اور موت کے سلسلے) کا ذکر کرتے تھے۔ وہ مستی میں ناچتے گاتے اور شراب پیتے تھے تاکہ وہ وجد کی اس حالت میں پہنچ جائیں جس میں انھیں اپنے محبوب سے وصال نصیب ہو۔ تیسری منزل بلھے شاہ کی ہے جو اپنی شاعرانہ فکر میں صوفیت کی انتہا تک پہنچ گئے۔ وہ شریعت کو رد کرکے اس کی تضحیک کرتے تھے۔ جنت اور دوزخ سے انھیں کوئی واسطہ نہ تھا۔ بلکہ یوں کہئے کہ انھوں نے اسلام ہی کو رد کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنے بصائر عشق اور اس کے آوردہ وجد کے ذریعہ حاصل کیے۔ انھوں نے خود کو قدیم

ویدانتی فکر کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ کر دیا تھا۔ وہ خدا کو اس کی بنائی ہوئی ہر شے میں اور اپنے چاروں طرف دیکھتے تھے۔ انھوں نے رام، کرشن اور رسول اللہ ؐ سب کے گیت گائے اور مذہبی افتراق کو ماننے سے انکار کیا۔ شاعرانہ کمالات اور روحانی تکمیل کے نقطۂ نگاہ سے وہ صوفی شاعروں میں سب سے اعلیٰ ہیں۔

اس کے پہلے کہ ہم بابا فرید کی شاعری کا کچھ تفصیل سے مطالعہ کریں، شریعت کے بارے میں چند الفاظ کہنا کار آمد ہوگا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے شریعت زندگی کا مجموعۂ قوانین ہے اور اس کے ہر پہلو یعنی مذہبی، اخلاقی، سماجی، سیاسی اور معاشیاتی سب کا احاطہ کرتی ہے۔ مذہبی معیار کے مطابق مسلمان کو خدا، فرشتوں، قرآن، رسول اور معاد پر پورا عقیدہ ہونا لازمی ہے۔ اسے کلمے پر بھی پختہ اعتقاد ہونا چاہیے اور دن میں پانچ مرتبہ نماز ادا کرنا، روزہ رکھنا، حج کرنا اور زکوٰۃ دینا چاہیے۔ اس کی سماجی زندگی انکسار، طمانیت قلب، سخاوت، انصاف اور پاکیزہ طرز حیات جیسے اخلاقی اصولوں پر مبنی ہونی چاہیے۔ اسے توحید اور انسانی بھائی چارے پر بھی پورا اعتقاد ہونا چاہیے۔

بابا فرید کو شریعت پر گہرا اعتقاد تھا اور وہ اپنی ذاتی زندگی کو شریعت کے اصولوں کے تقاضے کے مطابق ڈھالنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے مریدوں کو بھی شریعت پر عمل کرنے کی نصیحت کرتے تھے۔ وہ شریعت کو روحانی زندگی کے لیے بے حد مفید اور اہم قرار دیتے تھے۔ بعد کے صوفیوں کے برخلاف انھیں شریعت اور صوفیت کی انتہا منزلوں میں کسی قسم کا تناقض نہیں نظر آتا تھا۔ حضرت منصور حلاج کی شہادت نے اس کشاکش کو واضح کر دیا تھا جو راسخ الاعتقادی سے شریعت پر اصرار اور صوفی کے ان تجربات کے درمیان ہے جن کے ذریعہ مذہبی انسان کی روحانی خواہشات پوری ہوتی ہیں۔ بابا فرید کا خیال تھا کہ شریعت اور روحانی تجربات ایک ہی حقیقت کے دو سرے ہیں۔ ایک نقطۂ آغاز ہے اور دوسرا نقطۂ انتہا۔ اگر طریقت عشق ہے تو شریعت طریق حیات ہے۔ دوسرے الفاظ میں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بابا فرید نے ماورائی حقیقت، محیط کل اور وحدت الوجود کے تصورات میں جو تناقض ہے ان کی تطبیق حاصل کر لی تھی۔ انھوں نے خدا کو انسان اور فطرت میں دیکھا اور اپنے تجربے کے حدود میں شریعت پر عمل اور خدا سے محبت دونوں کو وصول الی المعشوق کی جستجو کے دو پہلو قرار دیا۔ وہ چشتی سلسلے کے بانی خواجہ معین الدین چشتی کے اس ارشاد کے پوری طرح قائل تھے کہ "شریعت پر عمل کرنے میں پارسا اطوار کے ذریعے کمال حاصل کرنے کے بعد انسان "طریقت"

کی منزل پر پہنچتا ہے اور وہاں سے ''معرفت'' اور ''حقیقت'' کو پہنچتا ہے۔''

ہم اپنے مطالعے کو بابا فرید کے اسی کلام تک محدود رکھیں گے جو گورو گرنتھ صاحب میں شامل ہے، یعنی چار گیت اور ایک سو بارہ اشلوک۔ یہ اشعار جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے ملتانی پنجابی میں لکھے گئے ہیں۔ ان کے انگریزی میں کئی ترجمے کیے گئے ہیں، لیکن شاعری اپنے معنویت کے نازک اور لطیف فروق کی بنا پر اپنی کلیت میں ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل نہیں کی جاسکتی۔ ہر زبان کی ایک مخصوص لذت ہوتی ہے اور وہ اس کے سماجی اور تہذیبی پس منظر سے بہت قریبی تعلق رکھتی ہے اور اس زبان کے تشبیہات اور استعارات اس کے متداول روایات، دیو ملا اور تاریخ سے ماخوذ ہوتے ہیں جو اسے اپنا ایک مخصوص رنگ دیتے ہیں۔ یہ محض لسانیات کا یا اشعار کے مفہوم کی ترسیل کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک بڑے صوفی کے دل کی دھڑکن اور جذبات کا پرجوش اظہار ہے اور اس داخلی معنویت کا بھی ہے جسے وہ موسیقی اور الفاظ کے جادو کے ذریعے ہم تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اس لیے یہ ظاہر ہے، اور فطری بھی ہے، کہ جن لوگوں کو پنجابی زبان آتی ہے ان پر ان اشعار کا اثر زیادہ گہرا ہوگا بہ نسبت ان کے جو ان کا مطالعہ انگریزی ترجمے کی شکل میں کریں گے۔ بہرحال ہماری یہ کوشش رہے گی کہ ان اشعار میں جو دانشورانہ اور متصوفانہ معنی کا بہاؤ ہے اس کا کچھ احساس آپ تک پہنچ سکے۔

جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے بابا فرید صوفی تھے اور روحانی تجربے کی تلاش میں محو تھے، لیکن وہ بہرحال اسلام کے پروردہ و پرداختہ تھے۔ خدا کا اسلامی تصور یہ ہے کہ وہ واحد اور حاکم مطلق ہے، مقتدر، پیدا کرنے والا، مارنے والا اور حفاظت کرنے والا، اتھاہ، ناپیداکنار اور لامحدود۔ وہ رحم دل ہے لیکن انصاف کرنے والا ہے۔ قیامت کے دن ایمان لانے والے نیک بندوں کو انعام ملے گا اور وہ جنت کا لطف اٹھائیں گے اور گناہ گار دوزخ میں سزا پائیں گے۔ راگ ''آسا'' میں کہے گئے ایک بھگتی گیت میں فرید نے انسان اور خدا کے رشتے کو یوں بیان کیا ہے:

وہی سچے بھگت ہیں جن کا دل
خدا کے عشق میں واقعی ڈوبا ہوا ہے
وہ جن کے دل کا حال کچھ ہے اور زبان پر کچھ
وہ جھوٹے ہیں اور بے وفا ہیں
سچے ماننے والے خدا کی محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں

اور ہمیشہ اس احساس سے وجد کی کیفیت میں رہتے ہیں
جو خدا سے بے اعتنا ہیں وہ اس دنیا پر بوجھ ہیں
سچے بھگت وہ ہیں جنہیں خدا نے اپنے ساتھ باندھ لیا ہے
مبارک ہیں وہ اپنی پیدائش میں اور کامیاب ہے ان کی زندگی
تو ہی پالنے والا ہے، اتھاہ، رسائی سے باہر
میں ان قدموں میں سجدہ کرتا ہوں جنھوں نے تجھے حاصل کر لیا
تو ہی ہم سب کو بخشنے والا ہے
شیخ فرید کو اپنے عشق کی بھیک دے۔

بابا فرید نے خدا کی تعریف ایسی ہستی کی طرح کی ہے جو ہر جگہ موجود ہے اور انسانی فہم کے پرے ہے۔ وہ اپنی مخلوق کا سرپرست اور محافظ ہے لیکن وہ رسائی سے باہر اور لامحدود ہے۔ فرید ان لوگوں کے قدم چومنے کو تیار ہیں جنھوں نے خدا کی بشارت حاصل کر لی ہے۔ خدا کے سچے عاشق صرف وہی ہیں جو اسے دل و جان سے چاہتے ہیں نہ کہ وہ بے اصول اور بے وفا لوگ جن کی حرکتیں ان کے دعووں کو جھٹلاتی ہیں۔ بابا فرید مزید ارشاد فرماتے ہیں کہ خدا کی بشارت صرف انھیں کو حاصل ہوتی ہے جو ہمیشہ اس کے "عشق" میں جیتے ہیں۔ باقی سب تو اس دنیا پر محض ایک بوجھ ہیں۔ سچا درویش وہی ہے جو خدا کے فضل کے ذریعہ طریقِ عشق پر چلتا ہے اور وہی زندگی کے صحیح مقصد کی تکمیل کرتا ہے۔ وہ خدا کو رحیم و کریم کے نام سے پکار کر اس گیت کو ختم کرتے ہیں اور خدا سے التجا کرتے ہیں کہ انھیں عشقِ الٰہی کی بھیک عطا ہو۔

وحدت الوجود کے قائل ہونے کے باعث اگرچہ بابا فرید کا اعتقاد تھا کہ خدا خود کو اپنی مخلوق کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے، لیکن وہ بے وجہ جنگلوں اور ریگستانوں میں در بدر گھومنے کو بیکار عمل سمجھتے ہیں۔ اور ان چیزوں کو اس وجہ سے رد کرتے ہیں کہ خدا انسان کے ہی دل میں موجود ہے:

فرید تو کیوں ویرانوں میں گھومتا ہے
کانٹوں کو اپنے پیروں تلے روندتا ہے
خدا تو دل میں بستا ہے
اسے ویرانوں میں مت ڈھونڈ۔

یہ اشلوک دو طرح سے بہت اہم ہے۔ فرید نے ان جوگیوں کے طرزِ تیاگ پر ملامت کی ہے جو اپنا گھر

بار چھوڑ کر خدا کی تلاش ویرانوں میں کرتے ہیں۔ فرید کے لیے ترک دنیا کا مطلب تھا دنیاوی چیزوں اور گنہ گارانہ طرز حیات کو ترک کرنا۔ ہمیں چاہیئے کہ انسان کے بیچ میں رہ کر وصول الی اللہ کی سعی کریں اور اگر خدا انسانوں کے دل میں بستا ہے تو انسانوں کی مدد کریں کہ وہ اسے انسانوں کے دل میں پا سکیں۔

بابا فرید کے اشلوکوں میں ایک اشلوک گورو ارجن کا ہے جس کے مخاطب بابا فرید ہیں۔ اس میں خدا کے وجود کا اس کی مخلوق میں اظہار کا مضمون انتہائی بلاغت سے بیان کیا گیا ہے:

اے فرید! خالق، مخلوق میں بستا ہے
اور مخلوق خالق میں
اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے
تم برا کسے کہتے ہو؟

فرید خدا سے محبت کے جذبے میں پوری طرح شرابور ہیں اور اگر انھیں کبھی شک اور وسوسہ بھی ہوتا ہے تو وہ خدمت خدا پر اصرار کرتے ہیں اور اپنے ارادے کو پختہ کرتے ہیں، اور خود سے درختوں کے سے صبر اور استقامت کا تقاضا کرتے ہیں:

اے فرید، خدا کی خدمت کر
اپنے دل کے وساوس کو دور کر
درویشوں کو درختوں جیسی استقامت چاہیئے۔

جب زندگی کی ساری مٹھاس بھی زہر میں بدل گئی ہو تب بھی بابا فرید سوائے خدا کے کسی اور کی طرف منہ نہ کرتے کیونکہ انھیں سوائے خدا کے کسی اور پر اعتقاد نہیں:

دیکھو فرید، یہ کیا ہو گیا ہے۔ شکر
زہر بن گئی ہے
میں کس سے اپنا دکھ بتاؤں
سوائے اپنے خدا کے

ایک بہت ہی لطیف زبان میں کہے ہوئے اشلوک میں فرید نے خدا کی ہستی کی مٹھاس کا موازنہ پکی ہوئی کھجور اور شہد سے کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اصرار کیا ہے کہ زندگی کی محدود مدت میں ہر دن کا گزر جانا مسرت کی اس میزان میں سے کچھ کم کر دینا ہے جو زندگی سے اخذ کی

جا سکتی ہے:

خدا پکی ہوئی کھجوروں کے مانند ہے
شہد کی ندی کے مانند
ہاں، ہر دن جو کہ گزرتا ہے
زندگی سے ایک دن چھین لے جاتا ہے۔

اس اشلوک کے یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ انسان کی زندگی مختصر ہے اور اسے چاہئے کہ اس کی تقدیر میں جو دن ہیں ان کا بھرپور لطف اس مٹھاس کو چکھنے میں اٹھائے جو خدا کے تصور میں مستغرق ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس مٹھاس کا موازنہ انھوں نے شہد اور پکی ہوئی کھجور سے کیا ہے۔ کنایتاً وہ اس لطیف اور بیش قیمت مسرت کا موازنہ دنیا کی کھوکھلے اور عارضی خوشیوں سے کرتے ہیں، وہ خوشیاں جو زہر میں تبدیل ہو جانے والی ہیں، جیسا کہ اس سے پہلے اشلوک میں بتایا گیا ہے۔

بابا فرید کو انسان کی جستجوئے سکون اور دنیا کو جیت لینے کی تمنا کا بھی احساس ہے۔ معلم اخلاق فرید، انسان کو رائے دیتے ہیں کہ سکون حاصل کرنے کے لیے اپنے دل کو پاک کرنا چاہئے اور مزید کہتے ہیں کہ نفس کی پاکیزگی خدا کے وصل کی طرف لے جاتی ہے۔ اور جب ایک بار یہ وصل کسی کو حاصل ہو جاتا ہے تو پوری دنیا اس کے قدموں میں ہوتی ہے:

(خدا فرماتا ہے)
اگر تو اپنے آپ کو سجائے سنوارے گا، تو
مجھ سے مل پائے گا
مجھ سے ملنے پر تجھے سکون مل جائے گا
اے فرید اگر تو میرا ہو جائے گا
تو ساری دنیا تیری ہو جائے گی

بابا فرید خدا کی تصویر کشی اس قادر مطلق کی حیثیت سے کرتے ہیں جس کی مرضی کائنات کے ساری جاندار اور غیر جاندار مخلوق پر حاوی ہے۔ کسی کی ہمت نہیں ہے کہ اس کے تعین کردہ حدود سے آگے بڑھے۔ دریا سے مخاطب ہو کر وہ کہتے ہیں:

اے دریا اپنے کناروں کو نہ توڑ، کیونکہ
تجھے بھی اپنا حساب اپنے خدا کو دینا ہے

تو اپنے حدود میں بہہ
جیسے کہ خدا کی مرضی ہے۔

آخر میں ہم خدا کی مٹھاس کی طرف آتے ہیں۔ یہ ان کا ذاتی تجربہ ہے۔ انھوں نے اسے چکھا ہے، جانا ہے اور محسوس کیا ہے۔ اشعار ان کے دل سے پھوٹ پڑتے ہیں اور ان کے واردات کی تونگری اور گہرائی کا اظہار کرتے ہیں:

مٹھائی میٹھی ہے اور شکر اور شہد
اور بھینس کا دودھ بھی میٹھا ہے
ہاں یہ سب چیزیں میٹھی ہیں۔
لیکن ان سے کہیں زیادہ میٹھی ہے
خدا کی ہستی۔

ظاہر ہے کہ فرید نے بھی اس مٹھاس کا ذائقہ چکھا تھا اور انھیں گنج شکر کا خطاب بہت بجا ملا تھا۔

یہ ملحوظ ہے کہ مندرجہ بالا سبھی اشعار میں خدا کے وجود کا بہت گہرا شعور ہے۔ اس کا حاکمانہ ہاتھ کائنات کی رہ نمائی کرتا ہوا نظر آتا ہے، اسی کی موجودگی کا احساس تمام جاندار مخلوق میں ہوتا ہے۔ درویش کو تو فرید محبت کا راستہ اختیار کرنے کی رائے دیتے ہیں اور عام آدمیوں سے وہ کہتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو بہتر بنائیں تاکہ سکون حاصل کر سکیں اور انھیں یہ احساس ہو کہ وہ خدا کی ملکیت ہیں۔ ایک اشلوک میں بابا فرید نے کہا "لعنت ہے اس زندگی پر جس میں خدا کے علاوہ کسی اور پر بھروسہ کیا جائے۔" خدا کی مرضی کے سامنے یہ مکمل سپردگی ان کے کلام کا ایک بہت اہم موضوع ہے۔ ماسوا کو ترک کر کے خدا سے مکمل لگاؤ کے موضوع سے بڑھ کر جب ہم نماز کی طرف آتے ہیں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ فرید اصرار کرتے ہیں کہ مسلمان دن میں پانچ بار نماز ادا کریں جیسا کہ شریعت کا ارشاد ہے۔ وہ ایک سخت گیر استاد کے مانند کلام کرتے ہیں اور جو لوگ وضو نہیں کرتے اور معین وقت پر نماز نہیں ادا کرتے انھیں "کتے" کا خطاب دیتے ہیں انھیں کوئی جھجک نہیں وہ تو اس حد تک کہتے ہیں کہ جو سر خدا کے حضور میں سجدے میں نہیں جھکتا اسے ہانڈی کے نیچے بطور ایندھن استعمال کرنا چاہیے۔ اپنی شاعری میں بابا فرید کہیں بھی اس قدر ذاعاقی اور متقشف نہیں معلوم ہوتے جتنا کہ مندرجہ ذیل تین اشلوکوں میں:

فرید کہتے ہیں کہ اے کتے تو جو کہ نماز نہیں پڑھتا

تیری یہ عادت اچھی نہیں
تو کیوں نہیں دن میں پانچ بار مسجد جاتا ؟

اٹھو اے فرید، وضو کرو اور اپنے مالک کی عبادت کرو
اور جو کوئی بھی اس کو سجدہ نہیں کرتا
اس کا سر کاٹ دو

آخر اس سر کا کیا کیا جائے
جو خدا کے سامنے نہیں جھکتا
ہاں اسے مثل ایندھن کے
ہانڈی کے نیچے استعمال کرو

اہل اسلام فرشتوں پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ فرشتے خدا کے اشارے پر اپنے انفرادی فرائض پورے کرتے ہیں۔ فرشتوں کے علاوہ شیطان بھی ہے جو انسانوں کو گناہ اور غلط اعمال کی طرف لے جاتا ہے۔ ان کے ایک اشلوک میں شیطان کا صاف صاف حوالہ ہے:

فرید! انسان چیختے ہیں چلاتے ہیں اور ہمیشہ دوسروں کو ہدایت دیتے ہیں
لیکن جن کو شیطان نے گمراہ کر دیا ہے وہ کس طرح
خدا کی طرف رجوع ہوں ؟

لیکن ان سب اچھے اور برے فرشتوں میں سے بابا فرید اکثر موت کے فرشتے کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں موت کے مضمون کو بہت تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان روحوں کی جھلک بھی ہمیں ملتی ہے جو برسوں سے اپنی قبروں میں روز قیامت کا انتظار کر رہی ہیں، وہ دن جب لوگ دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور اپنے اعمال کے مطابق جنت یا دوزخ میں بھیجے جائیں گے۔

بابا فرید کے اشعار کا ایک نمایاں موضوع موت ہے۔ یہ زندگی کی بے رحم حقیقت ہے کہ انسان کے وجود کو معدوم ہونا ہے۔ موت ہمیشہ موجود ہے اس کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا موت کا ایک دن معین ہے اور اس کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا اور متعین دن اجل مثل شکاری پرندے کے

جھپٹا مارتی ہے اور زندگی کا چراغ گل کر دیتی ہے۔ بابا فرید اس بگلے کی تشبیہ استعمال کرتے ہیں جو موت سے بے خبر دریا کے کنارے مزے لے رہا ہے جب اچانک موت شکرے کی صورت میں اس پر جھپٹتی ہے اور اس کا سارا کھیل ختم کر دیتی ہے:

فریدؔ بگلا دریا کے کنارے بیٹھا ہے اور
وہ مصروف لعب ہے اور اچانک
شہباز اس پر جھپٹتا ہے
جب الٰہی شہباز اس پر حملہ کرتا ہے تو
وہ اپنا کھیل بھول جاتا ہے
خدا وہ سب کچھ کر سکتا ہے
جو کبھی تصور میں نہیں آ سکتا

یہ حقیقت ہے کہ موت کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں ہو سکتی اور زندگی بے ثبات ہے، فرید کے ذہن میں ہمیشہ چھائی رہتی تھی۔ ایک اور اشلوک میں وہ زندگی کا موازنہ دریا کے کنارے لگے ہوئے پیڑ اور کسی کچے مٹکے کے اندر کے پانی سے کرتے ہیں۔ دونوں ہی ایک مختصر وجود سے زیادہ کی امید نہیں رکھ سکتے:

کتنے عرصے تک ایک پیڑ دریا کے کنارے
چین سے اگ سکتا ہے
آخر کب تک پانی ایسے برتن میں رہ سکتا ہے
جو کچا ہے۔

زبردست تشبیہات میں نہاں ایک دل کو چھو لینے والے بند میں بابا فرید اجل کی توصیف کرتے ہیں۔ اجل اس دولہے کی طرح ہے جو اپنی دلہن کو لے جانے کے لیے آیا ہے۔ جسم کی ہڈیاں توڑ کر وہ اسے لے جائے گا۔ روح کو دوزخ کے پل کے اوپر سے جانا ہے جو کہ بال سے بھی زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔ قرآن کے مطابق یہی وہ پل ہے جس پر سے انسان یا تو جہنم میں گر جائیں گے اور ازلی آگ میں جلتے رہیں گے یا کامیابی سے اس کو پار کر لیں گے اور کبھی نہ ختم ہونے والے سکون کی نعمت حاصل کریں گے۔ اور کبھی نہ ختم ہونے والی مسرتوں کے لطف سے فردوسی میدانوں میں بہرہ ور ہوں گے۔

گورو گرنتھ میں بابا فرید کا سب سے پہلا اشلوک وہ ہے جس میں ایک استادانہ پختگی کے ساتھ شاعر نے موت کے بعد روح کے سفر کا بیان کیا ہے:

دولہن کی شادی کا دن پہلے سے معین ہے
اور دیکھو اسی دن موت کا فرشتہ جس کے بارے میں
سب نے صرف سنا ہے تمہارے روبرو ہوگا
اور وہ تیری ہڈیاں توڑ کر زبردستی
تیری بے چارہ روح کو نکال لے گا
ہاں اپنی روح کو یہ سکھا دے کہ کوئی بھی
خدا کی مرضی سے مقابلہ نہیں کر سکتا
جان دولہن ہے اور موت دولہا جو اس سے شادی کر کے
اسے اپنے ساتھ لے جائے گا
جسم جان کو رخصت کرنے کے بعد کس کو گلے لگائے گا
بال سے بھی باریک ہے دوزخ کا پل
کیا تم نے اس کے بارے میں نہیں سنا
فرید جب تمہارا بلاوا آئے تو تم
ان جانے میں خود کو تاراج نہ ہو جانے دینا

کیسی بھیانک تصویر ہے انسان کی بے بسی کی، جب موت اس کے روبرو ہوتی ہے۔ وہ دن جو کہ پہلے سے ہی مقرر تھا لیکن جس کا اسے کوئی علم نہیں تھا۔ انسان نے موت کے فرشتے کے بارے میں سنا تو ہے لیکن دانستہ اس کے وجود کو بھلانے کی کوشش کی ہے مگر وہ ہیبت ناک فرشتہ آتا ہے، اس کی ہڈیاں توڑتا ہے اور اس کی روح کو اس کے جسم سے کھینچ نکالتا ہے۔ وہ مثل دولہے کے آتا ہے، مقتدر، مطلق العنان، سربرآوردہ، اور وہ دولہن یعنی روح کو لے جاتا ہے۔ بابا فرید کہتے ہیں کہ یہی خدا کی مرضی ہے، اور انسان کو سمجھنا چاہئے کہ کوئی اس سے روگش نہیں ہو سکتا۔ موت سے کوئی چھٹکارا نہیں ہے اور موت کے مقابل انسان کا کوئی دست گیر نہیں ہے۔ موت آتی ہے اور زندگی سے رخصت ہونا ہی پڑتا ہے، سارا جوش، جذبات اور پیار کے رشتے ختم ہو جاتے ہیں اور موت کے بعد کا سفر بالکل تنہا ہی جھیلنا ہوتا ہے بغیر کسی ہمراہی کے اور اس سفر میں روح کو دوزخ کا

پل پار کرنا ہے اور پل پار کرتے وقت ہرگز پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھنا ہے، چاہے اسے بہت سی آوازیں بار بار پکاریں۔ موت کے بعد روح کے سفر کا یہ پورا منظر اس لیے کھینچا گیا ہے تاکہ انسان کے دل میں خوف اور شدید ڈر پیدا ہو۔ لیکن فرید کے دل میں درد ہے، خوف وہ اس لیے پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ انسان کو یہ احساس ہو کہ اگر وہ برے کام کرے گا تو موت کے بعد اس کا کیا حشر ہوگا، تاکہ وہ اپنے خالق کی طرف رجوع ہو اور اس زندگی کے بعد کی زندگی میں اسے یقینی امن اور مسرت حاصل ہو۔

راگ ''سوہی'' میں فرید دوبارہ موت کے پل کا ذکر کرتے ہیں جو کہ نہ صرف تنگ ہے بلکہ دو دھاری تلوار کے مانند آب دار بھی ہے:

میرا راستہ ہیبت ناک اور ڈراؤنا ہے
وہ دو دھاری تلوار سے بھی زیادہ آب دار ہے
اور بہت تنگ
اس کے اوپر سے مجھے گزرنا ہے
شیخ فرید! خود کو اس راستے کے لیے تیار کر لو

اس بند میں سفر کے خطروں کو بیان کرنے کے بعد بابا فرید انسانوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ وہ شعوری طور پر اپنے آپ کو موت کے بعد کے سفر کے لیے تیار کر لیں۔

اس سفر کے لیے آخر کس طرح سے تیاری کی جاتی ہے؟ بابا فرید راگ ''آسا'' میں پوری طرح سے واضح کرتے ہیں کہ موت کے بعد کے سفر کی تیاری کا واحد طریقہ ہے خدا سے لو لگانا اور اس بات کو سمجھ لینا کہ یہ جسم مٹی میں مل جائے گا اور مرنے کے بعد دنیا میں واپسی نہیں:

شیخ فرید کہتے ہیں۔ اے میرے عزیز دوستو خدا سے لو لگاؤ
یہ جسم ایک دن مٹی ہو جائے گا اور اس کا ٹھکانہ
وہ بے توقیر قبر ہی ہے
آج خدا حاصل ہو سکتا ہے، شیخ فرید
اگر تو ان جذبات پر قابو پا لے جو تیرے دماغ میں ہیجان پیدا کرتے ہیں
اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میں مر جاؤں گا
اور دوبارہ کبھی واپس نہیں لوٹ پاؤں گا
تو میں اس جھوٹی نقلی دنیا سے لو نہ لگاتا

اور اپنے آپ کو برباد نہ کرتا

ایک اور اشلوک میں فرید انسان کے پورے سفر کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ وہ امیدیں جن کے ساتھ وہ اس دنیا میں آتا ہے، وہ زندگی جو وہ گزارتا ہے، اور پھر موت کے فرشتے کا آنا اور اپنے اہل و عیال کے کندھوں پر انسان کا دنیا سے واپس جانا۔ بابا فرید پھر زندگی کے اس سفر کو ان اعمال سے جوڑتے ہیں جو انسانوں نے اس دنیا میں انجام دیئے ہیں۔ صرف اچھے عمل ہی خدا کی بارگاہ میں اس کے کام آئیں گے:

ساڑھے تین من کا جسم پانی اور دانے پر جیتا ہے
انسان بڑی بڑی امیدیں لے کر دنیا میں داخل ہوتا ہے
جب موت کا فرشتہ آتا ہے، وہ جسم کا ہر دروازہ
توڑ کر کھول ڈالتا ہے
وہ انسان کو اس کے عزیز بھائیوں کی موجودگی ہی میں
قیدی بنائے گا
اور پھر وہ انسان چار آدمیوں کے کندھوں پر چلا جاتا ہے
لیکن فرید! جو اچھے عمل اس نے اس دنیا میں کیے ہیں
وہ خدا کی بارگاہ میں اس کے کام آئیں گے

موت کی ناگزیریت کا مضمون شدت کے ساتھ دہرایا گیا ہے:

میری آنکھوں کے سامنے سے بہت سارے لوگ گزرے
اور اس پار چلے گئے
فرید! ہر ایک اپنی تقدیر کے بارے میں فکرمند ہے
مجھے بھی اپنی فکر ہے۔

پھر:

اے شیخ! اس دنیا میں کسی کی زندگی مستقل نہیں
جس گدی پر آج ہم بیٹھے ہیں
اس پر نہ جانے کتنے بیٹھ چکے ہیں

صرف موت یا مرنے کو ہی بابا فرید نے اس قدر توجہ نہیں دی ہے بلکہ قبر میں جو طویل مدت

گزارنی ہے اور دوزخ کی آگ کے مضمون بھی اسی شدت سے بیان کیے گئے ہیں۔ انھیں اس بات کا خیال ہے کہ قبر میں کیڑے مکوڑے جسم کو کھا جاتے ہیں:

فرید، اینٹیں تیرا تکیہ ہوں گی اور دھرتی کے اندر
تو سوئے گا، کیڑے تیرا جسم کھائیں گے
اف تیرے لیے کتنی صدیاں گزریں گی
ایک کروٹ لیٹے لیٹے

دوزخ کی آگ اور گنہ گاروں کی چیخ پکار مندرجہ ذیل اشلوک میں بڑے محاکاتی انداز میں بیان کی گئیں ہیں:

فرید! موت اسی طرح نظر آتی ہے جیسے دریا کا دوسرا کنارہ
کہا جاتا ہے کہ دوسری طرف جلتی ہوئی دوزخ ہے،
تیز چیخوں سے گونجتی ہوئی
کچھ انسان ایسے ہیں جنھیں اس کا احساس ہے
تو بھی جان لے کہ اس دنیا میں کیے گئے عمل
دوسری دنیا میں ہمارے خلاف گواہی دیں گے۔

قبر میں روح کے طویل انتظار کو، دوزخ میں گناہوں کی سزا کو خدا کے انصاف سے جوڑا گیا ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ خدا کا انصاف انسانوں کے عمل پر منحصر ہے۔ خدا سے لو لگانا ہی واحد راستہ ہے اپنے کو عذاب دوزخ سے بچانے کا۔ اور اسی کا احساس سب کو ہونا ضروری ہے:

حویلیاں اور محل، سب خالی اور ویران ہو جاتے ہیں
اور آخر میں سب دھرتی کے اندر ہی سوتے ہیں
اور بیچاری روحیں طویل عرصے تک 'روز قیامت کے
انتظار میں پڑی رہتی ہیں
اس لیے اے شیخ! خود کو خدا کے لیے نثار کر دو
عبادت کرو، کیونکہ آج یا کل شاید
تمہاری بھی آخری سانس ہو، خدا کو یاد کرو

شاعر کا دل انسان کے لیے رحم اور درد سے بھرا ہوا ہے۔ بابا فرید لاپروا انسان کو بار بار یاد دلاتے ہیں

کہ مرنے کے بعد اس کا کیا حشر ہوگا اور کس چیز میں اس کی نجات ہے۔

بابا فرید لمبی رسی سے بندھے مٹی کے گھڑے کو کنوئیں سے کھینچے جانے کی گھریلو تشبیہ کا استعمال انسان کے سفر حیات کی منظر کشی کے لیے کرتے ہیں۔ خوبصورت گھڑا جسم ہے اور لمبی رسی دراصل انسانی نفس کی زنجیر ہے جو زندگی کو برقرار رکھتی ہے۔ جب موت کا فرشتہ آتا ہے تو یہ زنجیر ٹوٹ جاتی ہے اور رنگین گھڑا چکنا چور ہو جاتا ہے۔ اس موضوع پر بابا فرید کے دو اشلوک ہیں۔ ایک میں موت کا فرشتہ مہمان یا گھر کا داماد بن کر آتا ہے۔ اس طرح بابا فرید زندگی اور موت کے آخری اندواج پر زور دیتے ہیں۔ دوسرے اشلوک میں وہ کہتے ہیں کہ جب رسّی ٹوٹتی ہے تو ان لوگوں کی زندگی کا تار بھی ٹوٹ جاتا ہے جنھوں نے اس دنیا میں اپنے قیمتی سال برباد کیے ہیں۔ وہ لوگ اس کڑوی حقیقت سے منہ موڑے ہوئے ہیں کہ انسان صرف ایک ہی بار دنیا میں آتا ہے اور اسی ایک زندگی میں ہی اسے وصال معشوق حاصل کرنا ہے:

جسم کا خوبصورت گھڑا چکنا چور ہو گیا ہے
سانسوں کی مضبوط رسّی ٹوٹ گئی ہے
کس کا، آخر کس کا مہمان آج موت کا فرشتہ ہے؟

اور

خوبصورت گھڑا پارہ پارہ ہو جاتا ہے اور
زندگی کی تنی ہوئی ڈور ٹوٹ جاتی ہے
وہ جو اس جہان پر ایک بوجھ تھے
آخر وہ کیوں پیدا ہوئے؟ آخر کیوں؟

یہی ہے وہ لازوال سوال: آخر دنیا میں زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اس کے پہلے کہ زندگی کی ڈور ٹوٹ جائے اور گھڑا چکنا چور ہو جائے ہر انسان کو زندگی کے مقصد اور اس کی اہمیت کا احساس ہونا چاہئے اور ایسا کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے جو آنے والی زندگی میں کام آئے۔

اور وہ لوگ جو خدا کو بھول گئے ہیں، وہ اس زندگی میں بھی مصیبتیں اور دکھ اٹھائیں گے اور حیات آئندہ میں بھی کوئی جگہ نہ پا سکیں گے:

ان کے چہرے کتنے بھیانک ہیں جو
خدا کا نام بھول گئے ہیں

یہاں بھی وہ درد سے تڑپتے ہیں اور
اس کے بعد بھی انھیں کوئی راحت یا ٹھکانہ میسر نہ ہوگا

لیکن جنھوں نے اپنے دل غرور اور لالچ سے پاک کر دئے ہیں اور جو دولت کے گھمنڈ یا ناامیدی کے دلدل میں ملوث نہیں ہوئے ہیں، وہ عذاب دوزخ سے بچے رہیں گے:

فرید! اپنے دل کو میدان کے مانند بنالو
اس کے سارے گڈھے اور پہاڑ برابر کر ڈالو
تب دوزخ کی آگ تمہیں کبھی نہ چھو سکے گی

شریعت کے مطابق اس دنیا کا خاتمہ روز قیامت کو ہوگا جب بہت بھیانک زلزلہ آئے گا اور سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔ روحیں قبر میں کانپیں گی کیونکہ ایسا طوفانی دن کسی نے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ پھر صور پھونکا جائے گا اور مردے دوبارہ زندہ ہوں گے اور ہر ایک کو اپنے اعمال کا حساب دینے کے لیے باری باری بلایا جائے گا۔

بابا فرید نے اپنے ایک اشلوک میں روز قیامت کی طرف ہماری توجہ منعطف کی ہے۔ وہ استعارتاً دنیا کو ایک بڑی جھیل سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے کناروں پر بہت ساری چڑیاں اپنے گھونسلے بناتی ہیں۔ ایک ایک کر کے سب چڑیاں اڑ جاتی ہیں صرف کچھ کنول کے پھول بچ رہتے ہیں۔ وہ پھول بھی ایک دن مرجھا جائیں گے اور آخر میں ایک روز وہ جھیل (یعنی دنیا) خود بھی سوکھ جائے گی اور کچھ بھی نہ باقی بچے گا:

وہ چڑیاں جن سے جھیل کے کنارے پر چہل پہل تھی
اب اڑ گئی ہیں
فرید! صرف افسردہ رنگ والا کنول ہی باقی رہے گا
اور وہ تالاب بھی ایک دن سوکھ جائے گا۔

اور پھر روز قیامت آئے گا اور اعمال نامے کھولے جائیں گے اور ہر روح کو اپنے رب کا سامنا کرنا پڑے گا اور جواب دہی کرنی ہوگی کہ دنیا کے قیام میں اس نے اپنا وقت کس طرح گزارا:

فرید انسانوں نے دن کی چاروں گھڑیاں
ادھر ادھر بھٹکنے میں گزار دی ہیں
اور رات کی چاروں گھڑیاں سونے اور غفلت میں

خدا تجھ سے حساب مانگے گا اور پوچھے گا کہ
تم کیوں دنیا میں آئے ؛

مندرجہ بالا اقتباس میں بابا فرید نے اظہار افسوس کیا ہے کہ انسان اپنا قیمتی وقت یونہی غفلت میں گنوا دیتا ہے ۔

گناہ و سزا کا تصور ہر مذہب میں مشترک ہے ۔ شریعت اسلامی میں گناہ اور سزا پر خاص زور دیا گیا ہے ۔ فرید کے لیے اس دنیا میں گناہ کا تصور ایک جیتی جاگتی اصلیت ہے اور کئی انداز سے وہ اس سختی کو بیان کرتے ہیں جو گنہ گاروں کو اپنے برے کاموں کی سزا کے طور پر بھگتنا ہوگی ۔ وہ جو دنیاوی عیش و عشرت میں ڈوبے ہوتے ہیں اور خود کو بھولے ہوئے ہیں انھیں موت کے بعد سزا کے لیے بطور خاص منتخب کیا جائے گا :

فرید! کچھ کے پاس تو بہت سارا آٹا ہے ،
کچھ کے پاس نمک تک نہیں ہے
جب سب چلے جائیں گے تب معلوم ہوگا
کہ کس کو سزا کی تکلیف اٹھانی ہے

اور دوبارہ :

فرید! میری روٹی لکڑی کی بنی ہے اور بھوک میری چٹنی ہے
وہ لوگ جو مکھن لگی روٹی کھاتے ہیں بہت درد اٹھائیں گے

بابا فرید دیہات کے طرز زندگی سے دو استعارے لے کر بڑے موثر انداز میں اس سزا کا ذکر کرتے ہیں جو سب گنہ گاروں کا صلہ بنے گی :

فرید جب تم دربار کے پھاٹک پر گئے
تو کیا تم نے بڑا سا گھنٹہ نہیں دیکھا ؟
جب وہ بے گناہ اس قدر پیٹا جاتا ہے
تو ہم گنہ گاروں کی کیا حالت ہوگی ؟

اور پھر کہتے ہیں :

فرید دیکھو روٹی کا کیا حال ہوتا ہے اور
تخم کنجد کا کیا حشر ہوتا ہے

نیشکر، کاغذ، مٹی کے برتن اور کوئلہ
جیسی سزا ان سب کو ملتی ہے ویسی ہی سزا
ان کا انتظار کر رہی ہے
جو برے کام کرتے ہیں ۔

ان دونوں اشلوکوں میں فرید اس عقوبت پر زور دیتے ہیں جو معصوموں کو بلا وجہ جھیلنی پڑتی ہے۔ تو پھر وہ لوگ بھلا کیسی سزا کے حق دار ہوں گے جنھوں نے واقعی گناہ کیے ہیں؟ دونوں اشلوکوں میں وہ دھیرے دھیرے مگر بڑے شعوری طور پر گناہ گاروں کی سزا اور ہمارے دل میں اس کے خوف کے احساس کو طول دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ برے کاموں کے برے نتیجے پر زور دے رہے ہیں اور ان کا مقصود ہے کہ خدا کا خوف دلوں میں پیدا ہو اور نیک اور بامعنی زندگی گزارنے کی طرف مائل ہوں۔

آپ نے غور کیا ہوگا کہ جب کہ بابا فرید ان عذابوں کے ذکر کو اکثر دہراتے ہیں جو گنہ گاروں کو دوزخ میں جھیلنے ہیں، وہ جنت میں ملنے والے عیش و آرام کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ وہ برائی کی تادیب اور تنبیہ کرتے ہیں لیکن اچھے کاموں کے لیے جنت کے خوابوں کی شکل میں کوئی رشوت وہ ہرگز نہیں دیتے۔ وہ ایک صوفی ہیں اور ان کی منزل ہے اپنے محبوب سے وصل۔ ان کے نظام میں جنت اور وہاں کے دنیاوی عیش و آرام کی کوئی جگہ نہیں چاہے وہ عیش و آرام کتنا ہی شاندار کیوں نہ ہو۔ بدی کو برا اس لیے کہا جاتا ہے کہ نیک زندگی کے راستہ میں رکاوٹ بن کر آتی ہے اور حصول معرفت کے لیے نیک اور پاکیزہ زندگی ہی سب سے اہم ترین عنصر اور سب سے پہلا قدم ہے۔ وہ چیز جو صوفی کو مطلوب ہے، دراصل ''نروان'' ہے جس میں انسان کے دل کی چھوٹی سی چنگاری درخشاں سورج (جو کہ کل روشنی کا منبع ہے) میں ضم ہونا چاہتی ہے۔ یہاں غم و شادی کی کوئی ہستی نہیں اور انفرادی روحیں اپنی انفرادیت کھو کر روح عالم گیر میں ضم ہو جاتی ہیں۔

سماجی اور اخلاقی خوبیوں پر عمل شریعت کا بھی حصہ ہے۔ ان کا بابا فرید کی شاعری میں نمایاں ذکر ملتا ہے۔ بے مثل اور منفرد انداز میں بابا فرید رحم، انکسار، تحمل، صبر اور دیگر خوبیوں کے گیت گاتے ہیں جو زندگی کو شیریں اور تونگر بناتی ہیں۔ یہ خوبیاں نہ صرف فرد کو سماج میں قبولیت دیتی ہیں بلکہ قرآنی شریعت کے مطابق خدا بھی انھیں کا دوست ہوتا ہے اور انھیں پر مہربان ہوتا ہے جو نیک کام کرتے ہیں۔

ایک سادہ سے شعر میں، ایسی صراحت سے جو سیدھا دل کو چھوئے، بابا فرید بدی کے بدلے میں نیکی کرنے کی وکالت کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ دنیا میں بھی سب کچھ حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے:

فرید! بدی کے بدلے میں نیکی کرو
اپنے دل کو غصّے سے مت ڈھانپ لو
اس طرح تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی
اور تمہیں سب کچھ مل جائے گا

اس اشلوک میں زندگی کا پورا فلسفہ بند ہے۔ اس میں جس خیال کا اظہار کیا گیا ہے اس پر عمل کرنا عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ کوئی ولی اللہ ہی اس پر عمل کر سکتا ہے۔ بدی کے بدلے میں نیکی کرنے کی قوت زندگی کی طرف ایسے رویئے کا تقاضا کرتی ہے جو کہ واقعی نایاب ہے۔ اپنے دل سے غصہ کو ہٹا دینے کا کنایتاً یہ مطلب ہے کہ غصہ کے بدلے میں محبت کو دل میں جگہ دی جائے۔ اگر کوئی یہ کر سکے تو اسے سب جسمانی تکلیفوں سے چھٹکارا مل جائے اور سب کچھ مل جائے۔ اس طرح سادہ گھریلو انداز میں بابا فرید زندگی کے بہت عمیق اصول سکھاتے ہیں۔ کس طرح دکھ درد پر غالب آتا ہے اور کس طرح سکون باطن حاصل کرتا ہے۔ یہاں فنِ شعر اپنی انتہائی سادہ اور سب سے حسین شکل میں نظر آتا ہے۔ بابا فرید کس درجے کے انکسار کی تعلیم دیتے ہیں؟ یہ طمانچہ مارنے والے کے سامنے محض دوسرا گال ہی نہیں پیش کرنا ہے بلکہ اس کے پاؤں چومنا ہے:

فرید! اگر لوگ تمہیں گھونسوں سے مارتے ہیں
تو تم ان کے ساتھ اسی طرح کا برتاؤ مت کرو
نہیں تم ان کے پاؤں چومو اور اپنے گھر جاؤ۔

لیکن بابا فرید اس سے بھی ترقی کر کے انسانوں کو گھاس جیسا حقیر درجہ اپنانے کو کہتے ہیں، تاکہ دوسرے لوگ انھیں اپنے پیروں تلے روند سکیں۔ سچے اہل اللہ کی طرح وہ بتاتے ہیں کہ خدا کی بارگاہ میں داخل ہونے کا یہی ایک راستہ ہے:

فرید! اگر تم وصلِ خدا کی تڑپ رکھتے ہو
تو راستے کی گھاس بن جاؤ جس کو لوگ کچل سکیں
جب ایک آدمی تمہیں توڑے گا اور دوسرا کچلے گا
تب تم خدا کی بارگاہ میں داخل ہوگے۔

یہاں تک کہ ہمیں گرد کو بھی برا بھلا نہیں کہنا چاہیئے۔ یہ سچ ہے کہ گرد سب سے نیچے درجے کی شے سے بھی حقیر ہے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اگرچہ ہم پوری زندگی اسے اپنے قدموں تلے روندتے ہیں لیکن ہماری باہمی جگہ بدل بھی سکتی ہے :

فرید! خاک کو برا بھلا مت کہو
اس کے جیسا کوئی نہیں
جب ہم زندہ ہیں تو وہ ہمارے قدموں تلے ہے
جب ہم مردہ ہیں تو وہ ہمارے اوپر ہے

یہ سمجھانے کے لیے کہ محبت اور لالچ کا ساتھ رہنا ناممکن ہے بابا فرید ٹپکتی ہوئی جھونپڑی کی تشبیہ کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ کس قسم کا عشق ہے جو ہوس سے ہم آہنگ ہو؟ یقیناً وہ جھوٹا پیار ہے، اور بہت جلد ختم ہو جانے والا ہے۔ وہ عارضی ہے، جیسے کہ ایک ٹپکتی ہوئی جھونپڑی میں رہنا۔ اس اشلوک میں الفاظ کا درو لبعت سچ مچ دل کو چھو لینے والا اور خوبصورت ہے اور تشبیہ بھی غیر معمولی طور پر محاکاتی ہے :

فرید! جہاں ہوس ہے وہاں محبت بھلا کیا ہو سکتی ہے ؟
آخر تم کتنی دیر تک ایک ٹوٹی ہوئی
جھونپڑی میں ٹھہر سکو گے
جب موسلا دھار پانی برس رہا ہو ؟

اسی سے ملتے جلتے انداز میں ایک جگہ وہ قناعت سکھاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں :

فرید، سوکھی روٹی کھاؤ اور ٹھنڈا پانی پیو
دوسرے کی مکھن لگی روٹی دیکھ کر
اپنے دل کو للچانے مت دو۔

بابا فرید کے لیے مکھن لگی روٹی محض ترغیب کا سبب نہیں ہے بلکہ دکھ اور تکلیف کا سرچشمہ ہے۔ وہ جو خود کو دنیاوی عیش و عشرت کی نذر کر دیتے ہیں، مصیبت اور رنج و محن سے بچ نہیں سکتے۔ چپڑی روٹی عیاشی کی علامت ہے :

فرید! میری روٹی لکڑی کی ہے اور بھوک میری چٹنی ہے
وہ جو مکھن لگی روٹی کھاتے ہیں، بہت تکلیف اٹھائیں گے۔

قناعت اور صبر کی خوبی بابا فرید ہمیں ان تین اشلوکوں میں سکھاتے ہیں۔ یہ اشلوک بغور مطالعے کے قابل ہیں:

صبر ہی کو اپنی کمان اور صبر ہی کو اپنی کمان کی تانت بنالو
صبر ہی تمہارا تیر ہے
اور رب تمہارا نشانہ چوکنے نہ دے گا

اور

کس صبر سے صابر لوگ اپنے جسم کو مجروح کرتے ہیں
کہ وہ خدا کے نزدیک آجاتے ہیں!
لیکن اپنا راز وہ کسی کو بتاتے نہیں

اور

یہ صبر ہی واحد مقصود ہے، اے فانی انسان!
تو اگر اسے اختیار کرے
تو ایک بڑا دریا بن جائے گا
نہ کہ اس کی چھوٹی سی شاخ

زبان کے اعتبار سے یہ بابا فرید کے غالباً سب سے مشکل اشلوک ہیں۔ ملتانی اور پنجابی الفاظ میں فارسی کے الفاظ پیوستہ ہیں۔ تشبیہات زندگی کے مختلف پہلوؤں سے ماخوذ ہیں۔ تیر کمانوں اور تانتوں کی دنیا، ریاضت گزاروں کے جسم کا مجروح ہونا اور طاقت ور دریاؤں کا سیلاب وغیرہ وغیرہ۔ لیکن منزل ایک ہی ہے: صبر اور تحمل سے صوفی خدا کو تلاش کرتا ہے۔ یہی اس کی پہچان ہے، اس کا راز ہے اور اس کا واحد مقصود۔ اور یہی چیز ہے جسے انسان کو بھی سیکھنا ہے۔ صوفی کا سفر نہ صرف دشوار ہے بلکہ طویل بھی ہے اور صوفی سے اس کے سارے صبر و تحمل کا تقاضا کرتا ہے۔ بابا فرید دراصل اس بات پر زور دینا چاہتے ہیں کہ یہ تلاش بے سود نہیں ہے: خالق یقیناً اپنے بھگت کو انعام سے نوازے گا۔ اسے اپنا جزو بنائے گا اور وہ دریائے اعظم کا حصہ بن جائے گا اور محض چھوٹی سی شاخ نہ رہے گا۔

ان سب خوبیوں کا آخر کیا مقصود ہے؟ اس کا خلاصہ بابا فرید ایک اشلوک میں پیش کرتے ہیں:

انکسار ہی وہ لفظ ہے اور تحمل وہ خوبی
اخلاق وہ انمول جادو ہے
ان کو اپنا لباس بنالو اے بہن
اور تمہارا خاوند تمہارے قبضے میں آجائے گا

دوسرے الفاظ میں اخلاقی زندگی دراصل روحانی منزل حاصل کرنے کا راستہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بابا فرید کے لیے (دھیان) وجد اور وصل کے علاوہ زندگی کا کوئی مقصد اور کوئی جواز نہیں۔ لیکن صوفی کی روحانی پرواز کے یہ مقام تب تک نہیں حاصل ہو سکتے جب تک اخلاقی اور نیک و باعصمت طرز حیات کے ذریعہ زندگی کا تزکیہ نہ کیا گیا ہو۔

اس بات کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ شریعت کی پوری پابندی کے ساتھ زندگی گزارنے اور اس پر اعتقاد کے باوجود، شریعت کے کچھ بہت اہم پہلوؤں جیسے قرآن مجید، حضرت محمدؐ، کلمہ، زکوٰۃ اور حج کا ذکر بابا فرید کی شاعری میں نہیں ملتا۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اس کا سب سے ظاہری جواب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیونکہ ان کی شاعری کا یہ حصہ جو کہ گورو نانک کے طفیل آج ہمارے پاس محفوظ ہے وہ ان کی تصانیف کا محض چھوٹا سا حصہ ہے۔ یہ باعث افسوس ہے کہ بابا فرید کی کچھ کہاوتوں اور ان کی زندگی سے منسلک کچھ کرامات کے غیر معتبر تذکروں کے علاوہ ان کے پیرو اس غیر معمولی صوفی شاعر کے عربی، فارسی اور پنجابی زبانوں میں شاعرانہ اظہارات کو محفوظ رکھنے میں ناکام رہے۔ اردو اور فارسی کے اکا دکا اشعار، جن کا استناد مشکوک ہے، ضرور موجود ہیں۔ ان اشعار کا بنیادی مضمون ہے بابا فرید کا خدا سے گہرا لگاؤ اور انسانوں کے لیے محبت اور دردمندی کا جذبہ۔ لیکن استناد کی کمی کی باعث ہمیں مجبوراً ان اشلوکوں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے جو گورو گرنتھ صاحب میں موجود ہیں۔

یہ بات واضح ہے کہ بابا فرید بہت دین دار شخص تھے۔ اسلامی تہذیب اور ثقافت سے ان کا رشتہ گہرا اور دائمی تھا۔ ان کے تمام ارشادات اور تعلیمات قرآن مجید پر ہی مبنی تھے۔ کم عمری میں ہی انھوں نے قرآن حفظ کر لیا تھا اور دن میں ایک بار ختم قرآن کرنے کی عادت بھی ڈال لی تھی۔ وہ اللہ کے اسمار کا مراقبہ کرتے تھے اور دن میں پانچ دفعہ نماز پڑھنے پر زور دیتے تھے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے مسجد جانے اور قوم کے ساتھ باجماعت نماز پڑھنے پر بھی ان کا اصرار تھا۔ اس لیے یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ ان کی شاعری میں قرآن مجید یا رسول پاک کا کوئی ذکر ملتا ہے یا نہیں۔ بابا فرید کا پورا تصور ایمان قرآن مجید پر مبنی ہے، قرآن مجید جو کہ الہامی کتاب ہے اور جو رسول اللہ پر نازل ہوئی۔ اس کے علاوہ کلمے کی لفظیات

کی غیر موجودگی یا اس کی تفسیر کا ان کے تصانیف میں نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ جو شخص حضرت محمدؐ پر اعتقاد رکھتا ہے اس کا ان کے کلمے پر اعتقاد رکھنا بھی ظاہر سی بات ہے اور اس میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ زکوٰۃ کا ذکر بالواسطہ ان کے ایک اشلوک میں ملتا ہے۔ اشلوک نمبر ۱۲۸ میں بابا فرید کہتے ہیں:

ایسے چند ہی ولی اللہ ہیں
جو کہ دانشمند ہونے کے باوجود سادہ مزاج ہیں
جو طاقتور ہوتے ہوئے بھی کمزور ہیں
افلاس کے باوجود جو بھی ان کے پاس ہے
اسے تقسیم کر دیتے ہیں

یہ ایک خوبصورت اشلوک ہے جو ولی اللہ کی اہم خصوصیات کی وضاحت کرتا ہے۔ بزرگ اپنی طاقت کا مظاہرہ نہیں کرتا نہ ہی اپنی دانائی پر غرور کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے پاس چاہے تھوڑا سا ہو یا کچھ نہ ہو، وہ اسے دوسروں میں بانٹتا ہے۔ اپنی پوری دولت یا اس کے ایک حصے کو بانٹنے کو ہی زکوٰۃ کہتے ہیں۔

حج کا ذکر نہ ہونے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ فرید مذہب کے ظاہری رسوم، جیسے کہ روزہ اور حج وغیرہ سے کسی حد تک روگشی اختیار کرتے لگے تھے۔ جیسے جیسے ان کی عمر بڑھتی گئی وہ اپنے کو روح کی باطنی تلاش میں جذب کرتے گئے۔ وصل خدا کی خواہش اور شدید ہو گئی اور تکمیل کا تقاضا کرنے لگی۔ ان کے زہد نے اذیت نفس کا روپ اختیار کر لیا اور وقت بیش از بیش ریاضت اور عبادت میں گزرنے لگا۔ ایسے شخص کے لیے اور عشق الٰہی کے ایسے عالم میں حج کے کوئی خاص معنی نہیں تھے۔ اگرچہ بابا فرید نے روزے زندگی بھر رکھے کیونکہ وہ ان کی نفس کشی کا ایک حصہ تھے، لیکن ان کے مخصوص اور انتہائی مقصود یعنی وصول الی اللہ میں روزوں کی زیادہ اہمیت نہ تھی۔

آخر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فرید اپنے مریدوں اور ماننے والوں کو خدا اور اس کے رسول اور اسلام کے مذہبی اصولوں کے اعتقاد پر پختہ کرنا چاہتے تھے، شریعت کی پابندی پر اصرار کے ذریعے بابا فرید اپنے حلقے کے لوگوں کے طرز حیات کو ارفع و اعلیٰ

بنانا چاہتے تھے۔ وہ نہ صرف خدا اور اس کی محبت کے گیت گاتے تھے بلکہ نیکی، انکسار، تحمل اور قناعت و آسودگی جیسی سماجی خوبیوں کے بارے میں بھی نغمہ سنج تھے۔ بابا فرید شریف النفس ولی اللہ، بڑے شاعر، سچے مسلمان اور بے حد محبت کرنے والے شخص تھے۔

پانچواں باب

فرید بحیثیت شاعرِ طریقت

تصوف میں چار مدارج کا ذکر ہے جو خدا سے وصل کی منزل تک پہنچاتے ہیں : وہ ہیں شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت۔ اس کتاب میں ہم نے اسلام میں تصوف کے نشوونما کی مختصر تاریخ بیان کی ہے۔ صوفیت کا آغاز اس اسرار کے احساس سے ہوا جو قرآن مجید کے الہامی کلام میں موجود ہے۔ اس کے ساتھ رسول پاکؐ کی معراج، ایک لامحدود اور قوت بیان سے ماورا ہستی کی حیثیت سے اللہ کا تصور، رسول پاکؐ کے صحابیوں کی زندگیوں میں ریاضت اور زہد کی مثالیں، نوافلاطونیت اور اس کا وحدت الوجود کے عقیدہ پر اصرار، اور دنیا کی ہر شے بالخصوص قلب انسانی میں خدا کی ہستی کا ظہور بھی وہ تصورات اور معتقدات تھے جن کے ذریعہ تصوف کی داغ بیل پڑی۔

مندرجہ بالا تصورات سے روحانی کشش کے طور پر محبت کا تصور نمودار ہوا۔ اس سے یہ عقیدہ بنا کہ محبت ہی اس دنیا کی حقیقی بنیاد ہے اور ہر انفرادی روح کی سعی یہ ہے کہ اس عالمی روح میں دوبارہ ضم ہو جائے جس کا ایک حصہ وہ ہے۔ اس عشق کی بہت سی منزلیں ہیں، مجردسے حقیقی تک۔ فارسی شاعری میں اس کا اظہار جذباتی انداز میں کیا جانے لگا۔ لہٰذا فطری طور پر مذہب کے معنی وہ عشق الٰہی قرار پائے جس میں جذبات کے جوش کی اعلیٰ ترین حد نظر آئے۔ روحانی جستجو وجد یا عشق کے ہم معنی ہو گئی اور عشق الٰہی کا بیان انسانی جذبات کی لفظیات میں ہونے لگا جیسے کوئی انسان اپنی محبوبہ سے مخاطب ہو۔ انسانی محبت کی تشبیہات کا کھل کر استعمال ہونے لگا اور صوفیوں نے روحانی عشق کے تواجد کو رقص و سماع کے ذریعہ اور بھی غایت درجے تک پہنچا دیا۔ ہندوستان میں صوفیت پر ویدانت بدھ مذہب اور بھکتی تحریک کا اثر ہوا۔ صوفیت کی تبلیغ اور ترسیل صوفی سلسلوں کے ذریعہ ہوئی لیکن پنجابی زبان میں فریدالدین گنج شکر نے شعر کے توسط سے بھی اس کا اظہار کیا۔

جب ہم بابا فرید کے کلام کا جائزہ لیتے ہیں جو گورو گرنتھ صاحب میں "اشلوک شیخ فرید کے" کی شکل میں موجود ہے تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی ترتیب نہ موضوع کے اعتبار سے ہے اور نہ تاریخ کے لحاظ سے۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے ان اشلوکوں کو مختلف اوقات میں لکھا ہوگا۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں ان کے ذاتی تجربات اور مسائل حیات کے بارے میں ان کے اپنے تصورات جب جذباتی شکل اختیار کرتے ہوں گے تو ان کا اظہار شعر کے آہنگ میں ڈھل جاتا ہوگا۔ مختلف ذہنی کیفیات سے مسحور ہو کر ان کے اندر کا شاعر داخلی واردات کو اظہار کا جامہ پہناتا تھا۔

بابا فرید کو پہلا پنجابی صوفی شاعر بجا طور پر کہا جاتا ہے۔ ان کی شاعری کے سرسری مطالعے سے یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ اسلامی تہذیب کے شاعر ہیں۔ کیونکہ خدا کا تصور جیسا کہ رسول پاکؐ نے پیش کیا، نماز باجماعت، فرشتے، جنت اور دوزخ، روزِ قیامت پل صراط کو پار کرنا اور اخلاقی خوبیاں جو شریعت میں مذکور ہیں، یہ سب ان کے گیتوں کے مضامین ہیں۔ لیکن جب ہم غائر مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اوپر اوپر کی اسلامی رنگت پس منظر میں چلی جاتی ہے اور ایک مخلوط، ہر چیز پر چھا جانے والی انسان دوستی کی کیفیت ان کی شاعری پر حاوی ہو جاتی ہے اس کی دو وجہیں ہیں۔ پہلی تو یہ کہ بابا فرید کسی بھی جگہ رسول پاکؐ کا ذکر ان کے غزوات اور مہمات کی فتحوں کے حوالے سے نہیں کرتے۔ ان کو اسلام کی ملک گیری سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ نہ ملّا ہیں، نہ قاضی ہیں نہ ان کا کام دوسرے مذہبوں کی نکتہ چینی کرنا اور اپنے مذہب کو اونچا دکھانا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جب وہ شریعت کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کرتے بھی ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ روحانی جدوجہد اور انسانی رنج و محن کا احساس ان کے یہاں تبلیغ مذہب سے زیادہ شدید ہے۔ اول و آخر بابا فرید ایک گہرے مذہبی انسان کی حیثیت سے نظر آتے ہیں جو ہمیں خدا کے وجود کا احساس دلانا چاہتا ہے لیکن صرف اس خدا کا نہیں جو قرآن پاک کی آیات میں جلوہ گر ہے۔ ان کے خاص موضوع ہیں، انسان اور روحانیت۔ انسان اور دنیا میں اس کے مختصر قیام کے بارے میں ان کا تفکر گہرا ہے، انسانی زندگی کی بے اعتباری، ہمیشہ موجود موت کا خوف، عوام کی غریبی اور بھوک، دنیا میں ناانصافی طاقت و شان و شوکت کی اندھا کر دینے والی کشش اور آخر میں بے معنی مقاصد کے تعاقب میں قیمتی وقت کی دردناک بربادی، بابا فرید ان سب کے بارے میں فکرمند نظر آتے ہیں۔ جب وہ سماجی، اخلاقی خوبیوں کے گیت گاتے ہیں، تو وہ خوبیاں وہی ہیں جو دنیا کے سب مذہبوں میں مشترک ہیں اور وہ ان کی وکالت اس لیے کرتے ہیں کہ وہ روحانیت کی دنیا میں داخل ہونے والے راستے کی دہلیز کا کام کرتی ہیں۔

بابا فرید قدیم صوفیوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو نفس کشی اور ترک دنیا پر عمل کے باوجود مذہب اسلام کی جماعت میں شامل تھے۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا بابا فرید اسلام کے ظاہری رسوم سے دور ہوتے گئے۔ وہ مسلمان حکومت، حکومت کے نمائندوں، علما، قاضیوں وغیرہ سے کوئی واسطہ رکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ جیساکہ اوپر بیان ہوا ہے، علما اور قاضیوں نے تو بابا فرید کے خلاف سازش کی اور انھیں برا بھلا کہا۔ ان لوگوں نے بابا فرید اور ان کے بچوں کے لیے جینا دشوار کر دیا۔ لیکن صبر اور استقلال کے ساتھ انھوں نے ان سب رکاوٹوں پر فتح پائی۔ وہ عبادت کرتے اور روزہ رکھتے لیکن ان کی ساری ریاضت اور نفس کشی ان کے روحانی مقصود کے حصول کی طرف منعطف تھی۔ اس لیے مذہبی معاملات میں وہ عشق کے صوفیانہ اصول پر عمل کرتے تھے۔ وہ مذہب عشق کی تبلیغ کے پیرو تھے۔ خدا سے ان کا لگاؤ گہرا تھا اور وہ اس کے ذریعے خدا کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہ ایسا دلآویز، ایسا منہمک رکھنے والا عشق تھا جس میں کسی کے لیے نفرت کا کوئی عنصر تھا ہی نہیں۔ بابا فرید خدا سے محبت کرتے تھے اور اس کی مخلوق سے بھی محبت کرتے تھے۔ یہی بات تھی جس نے انھیں صوفی بنایا اور یہی بات بابا فرید اور کٹر مسلمانوں کے درمیان اختلاف کی وجہ بنی۔ جب ہم فرید کا کلام پڑھتے ہیں تو ہمیں ان کے عظیم الشان عشق اور اپنے محبوب کے لیے ان کی تڑپ کا احساس ہوتا ہے وہ شدید ترین جذبۂ قلبی کے ذریعہ خدا کی جستجو کرتے ہیں اور شدید ترین ریاضت اور نفس کشی مثلاً چلۂ معکوس پر عمل کرتے ہیں۔ یہی وہ عشق ہے جس کا اظہار ہمیں ان کی غیر فانی شاعری میں ملتا ہے اور جو انھیں اتنے اعلیٰ درجے کا صوفی شاعر بناتی ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ بابا فرید نے انسان کو زندگی کی فناپذیری کا احساس دلانا اپنا اولین فرض قرار دیا تھا۔

دنیا کے گلشن جمال میں چڑیا
محض ایک مہمان ہے
جب صبح کی نوبت بجے تو
اڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ

اس دنیا کی تشبیہ ایک خوبصورت باغ جیسی ہے جہاں چڑیا یعنی روح ایک مہمان کی طرح کچھ دن بسیرا کرنے کو آتی ہے۔ وقت مقررہ پر مہمان کو جانا ہی ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں دنیا ایک کارواں سرائے ہے جہاں مہمان مسافر رات گزارتا ہے اور جب صبح کا گھنٹہ بجتا ہے تو اسے سرائے کو چھوڑنا ہے۔ دنیا چاہے کتنی بھی خوبصورت ہو کسی کو بھی یہاں ہمیشہ رہنے کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ اس لیے عقلمندی

اسی میں ہے کہ زندگی بعد موت کے بارے میں سوچا جائے۔

فرید ہماری توجہ بالواسطہ طور پر کوچ کے دن کی طرف منعطف کرتے ہیں اور ہمیں دنیا کی ناپائداری کا احساس دلاتے ہیں:

اے فرید! تمہارے ماں باپ کہاں ہیں
جن کی تم اولاد ہو
تم سے پہلے وہ گزر گئے لیکن
تمہیں اب بھی اعتقاد نہیں ہے!

یہ واقعی حیرت کی بات ہے کہ ہم دوستوں اور عزیزوں کا اس دنیا کو چھوڑ کر جانا دیکھتے ہیں لیکن پھر بھی اپنی موت کا تصور نہیں کر پاتے۔ زندگی کی فنا پذیری کا خیال بابا فرید کو بار بار آتا ہے۔ اس کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے بابا فرید ہماری توجہ موسموں کی تبدیلی کی طرف منعطف کرتے ہیں، جب پتیاں جھڑ جاتی ہیں اور بیڑ منڈے اور ننگے ہو جاتے ہیں۔ اس عمل میں وہ تمام دنیاوی چیزوں کی بے ثباتی کی تصویر دیکھتے ہیں:

فرید! موسم بدلتا ہے، جنگل لرزتا ہے
بیڑوں نے پتیاں جھاڑ دی ہیں
میں نے سب کچھ چھان مارا۔ لاحاصل
جو کچھ دکھائی دیتا تھا، چلا گیا

موت کے نزدیک آتے رہنے کا احساس دلانے کے لیے بابا فرید ایک اور طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ بڑھاپا اپنی ساری کمزوریوں اور پچھتاووں کے ساتھ ناگزیر ہے۔ اس کی آمد کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ اس مضمون پر بابا فرید نے چار اشلوک لکھے ہیں اور ہر ایک کا مضمون یہ ہے کہ آہستہ گزرتے ہوئے سال و ماہ جسم و صحت کے زوال کے ذریعہ اپنے کو ظاہر کرتے ہیں اور ہمارے ناقابل فرار اختتام یعنی موت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ بابا فرید کو حیرت ہے کہ انسان پھر بھی دنیاوی عیش و عشرت کو نہیں چھوڑتا اور یہ نہیں سمجھ پاتا کہ اگر وہ سو سال بھی جئے گا تب بھی ایک دن آخر میں اس کا جسم مٹی میں بدل جائے گا:

شیخ فرید بوڑھا ہو گیا ہے
اور اس کا جسم لڑکھڑانے لگا ہے

اگر وہ سو سال بھی جیئے گا تو بھی
وہ ایک دن مٹی بن جائے گا

اور دوبارہ:

میرے دانت، میرے پاؤں، میری آنکھیں، میرے کان
سب نے جواب دے دیا ہے
میرا جسم پکارتا ہے، ہائے میرے سب چاہنے والوں نے
مجھے چھوڑ دیا

اور پھر:

فرید، میرے سر کے بال سفید ہو گئے ہیں،
میری ڈاڑھی سفید ہو گئی ہے
میری مونچھیں سفید ہو گئیں ہیں
اے میری نادان اور بے حس روح
تو کیوں لذات جسمانی میں مشغول ہے ؟

اور:

اپنے ان ننھے پیروں سے میں نے پہاڑ اور میدان
کی مساحت و پیمائش کی ہے
لیکن آج میرا وضو کا لوٹا بھی
سو میل کے فاصلے پر معلوم ہوتا ہے

اور آخر میں

دیکھو فرید، یہ کیا ہو گیا ہے، تمہاری ڈاڑھی
سفید ہو گئی ہے
اب مستقبل پاس ہے اور ماضی
بہت پیچھے رہ گیا ہے

بڑھاپا زندگی کے خاتمے کی یاد دہانی کرتا ہے، لیکن بڑھاپا بابا فرید کو مایوسی اور ترک امید پر آمدہ نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اب بھی زیادہ مصر ہو جاتے ہیں کہ اس لاپروا اور نادان انسان کو وقت پر صحیح قدم

اٹھانا چاہئے۔ زندگی مختصر ہے اور اس کا خاتمہ ہے بڑھاپا اور موت، لہٰذا قیمتی سال و ماہ کیوں برباد کیے جائیں۔ راگ "سوہی للت" میں دل کو چھو لینے والے، قوت حیات سے بھرپور ایک گیت میں وہ کھوئے ہوئے مناسب مواقع اور جوانی کے گزر جانے کا گیت گاتے ہیں:

اے شخص سن، تو نے اپنی کشتی کے بادبان
کو نہیں دیکھا جب تیرے پاس وقت تھا
اب طوفان چڑھے ہوئے دریا ہیں
آخر وہ کیسے تیرے گی؟
عارضی ہیں عیش و عشرت، کسم کے پھول کے مانند
چھوتے ہی افسردہ ہو جاتے ہیں

اے میرے محبوب اس کو چھونا نہیں
کہیں وہ سوکھ نہ جائے
یہ زندگی کی نازک دوشیزہ اپنے مالک کے
درشت لفظوں کے سامنے کانپ رہی ہے
جوانی ختم ہو گئی ہے: اب کبھی سینہ
شیر سے لبریز نہیں ہوگا
فرید کہتا ہے کہ اے میری روح کی بہنو، سنو
ایک دن زندگی کا ہنس "طوطا" کر"
اڑان بھرے گا
یہ جسم ایک مٹی کا ڈھیر بن جائے گا

یہاں بابا فرید خدا سے لگاؤ نہ رکھنے والی روح کے سفر کا موازنہ طوفانی سمندر میں گھری ہوئی بے پتوار کشتی سے کرتے ہیں۔ صحیح وقت پر تدارک نہ ہونے کے باعث اس کشتی کا بچنا مشکل بلکہ ناممکن ہوگا۔ انسان دنیاوی عیش و عشرت میں ڈوبا ہوا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ یہ لمحے بے ثبات ہیں اور کسم کے پھول کے مانند ختم ہو جائیں گے۔ عشق اور جوانی بھی ایک دن گذر جائے گی کبھی نہ واپس آنے کے لیے۔ ختم گیں۔ مالک زندگی کی اس بربادی کو دیکھتا ہے۔ اک دن روح بھی اڑ کر چلی جائے گی

اور جسم مٹی میں تبدیل ہو جائے گا۔ تشبیہات اور زبردست اسلوب سے تھرتھراتا ہوا یہ ایک بلند پایہ اشلوک ہے' اور یہ انسان کو لمحاتی عشرتوں سے لگاؤ اور اپنی روح کو بچانے کے واحد موقع کو رائیگاں کرنے کے خلاف آگاہ کرتا ہے۔

ایک دوسرے اشلوک میں بابا فرید کھوتے ہوئے موقع کے پچھتاوے اور ماضی کے دوبارہ واپس نہ آنے کی اہمیت کا اظہار کرتے ہیں:

جب عورت دوشیزہ ہوتی ہے تو وہ شادی شدہ ہونا چاہتی ہے
اور جب اس کی شادی ہو جاتی ہے
تو اس کی پریشانیاں شروع ہوتی ہیں
فرید! اس کو یہ پچھتاوا ہوتا ہے
کہ وہ دوشیزہ نہیں بن سکتی

اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ روح کے لیے اس زندگی میں نجات حاصل کرنے کا صرف ایک ہی موقع تھا' لیکن جب وہ کھو گیا تو وہ دوبارہ انسانی زندگی نہیں پا سکتا۔

بابا فرید افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر انھیں معلوم ہوتا کہ ان کے دن مختصر ہیں تو وہ اپنی زندگی یوں برباد نہ کرتے:

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میرے بیج اتنے کم ہیں
تو میں ان مٹھی بھر بیجوں کی دیکھ ریکھ کرتی
اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میرا دولہا اتنا کم عمر ہے
تو میں کچھ کم گھمنڈی ہوتی۔

اسی خیال کو اور اہمیت دینے کے لیے بابا فرید ایک اور تشبیہ کا استعمال کرتے ہیں:

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تیرے ساتھ میرے رشتے ٹوٹ جائیں گے
تو میں ان گرہوں کو اور کس لیتی
کیونکہ تیری طرح اے محبوب کوئی دوسرا نہیں
میں نے پوری دنیا چھان ڈالی

پہلے بند میں تل کے بیج سانسوں کی نمائندگی کرتے ہیں' جو کہ محدود ہیں اور جن کی دیکھ ریکھ احتیاط سے کرنی ہے۔ دوسری سطر میں "دولہے" کی مراد خدا سے ہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ

کم عمر دو بلے کی مانند خدا مجھے اپنی محبت کے لائق نہ سمجھے گا تو میں کم گھمنڈی ہوتا۔

دوسرے اشلوک میں بابا فرید کہتے ہیں کہ اگر انھیں معلوم ہوتا کہ دنیاوی تعیشات خدا سے ان کے لگاؤ کو کم کردیں گی تو محبت کے رشتے کی اس گرہ کو اور کس کر باندھ لیتے کیونکہ انھوں نے ساری دنیا چھان ماری لیکن خدا کے جیسا کوئی نہ ملا۔

ان اقتباسات میں بابا فرید زرخیز ماہ وسال کی بربادی پر افسوس کرتے ہیں اور زندگی کی کم عیاری کے نکتہ چیں ہیں۔ محبوب کی محبت کے کھو جانے کا افسوس ہے لیکن اس کے ساتھ ہی خدا کی بے مثل عظمت کا احساس بھی ہے۔ دوسرے الفاظ میں، چونکہ خدا جیسی بیش بہا کوئی شے نہیں ہے اس لیے زندگی خدا کو حاصل کرنے میں ہی صرف کرنی چاہیے۔

بابا فرید نے زندگی کے مسلسل منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور انھوں نے نہ صرف زندگی کے مختصر وجود بلکہ اپنی شان وشوکت پر گھمنڈ کرنے والے ان سلطانوں اور امرا کے گذر جاتے اور حکومتوں اور حویلیوں کے شرم ناک خاتمے کا بھی شدت سے اثر قبول کیا:

وہ جن کے لیے نقارے بجتے ہیں
جن کے سروں پر چتر لہراتے ہیں
شعرا جن کی تعریفوں کے گیت گاتے ہیں
جن کے احترام میں شہنائیاں گونجتی ہیں
آخر میں انھیں بھی ٹھہر جانا پڑتا ہے
شمشان گھاٹ میں
یا وہ قبر میں دفن ہوجاتے ہیں
غریبوں اور یتیموں کی طرح

اگر زندگی کم عیار چیزوں میں سب سے زیادہ کم عیار ہے اور موت ہی اس کا انجام ہے تو پھر حویلیوں اور محلوں کے کیا معنی ہیں جن سے ہم اس قدر وابستہ ہوجاتے ہیں؟ اس سوال کا جواب یہ ہے:

فرید اپنے دل کو گھروں، حویلیوں اور اونچے
محلوں سے مت لگاؤ
جب ناقابل وزن بھاری مٹی تم پر گرے گی

تب تمہارا کوئی دوست نہ ہوگا

اور پھر کہتے ہیں:

فرید، اپنا دل حویلیوں اور دولت پر مت آنے دو
قبر کے بارے میں سوچو
اس مقام کو یاد کرو
جہاں بالآخر تمہیں جانا ہے

اور حسن کتنا مختصر اور ناپائدار ہے؟ غیر معمولی طنزیہ انداز میں بابا فرید ان آنکھوں کا ذکر کرتے ہیں جو کبھی کاجل کی لکیر کا بوجھ بھی نہیں سہہ سکتی تھیں اور جو موت کے بعد چڑیوں کے گھونسلے بن جاتی ہیں:

فرید، میں نے ان آنکھوں کو دیکھا ہے
جو ساری دنیا کو مسحور رکھتی تھیں
کبھی وہ کاجل کی لکیر کا بوجھ بھی برداشت نہ کر سکتی تھیں۔
لیکن اب ان میں چڑیوں نے
انڈے دے کر بچے نکالے ہیں۔

کتنے غلط ہیں خوبصورت لوگ جو اپنی خود پسندی میں خدا کو بھی بھول جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کی تمام نفاست اور دلکشی برباد ہو جاتی ہے۔ بابا فرید اس حسین عورت کی تصویر کشی کرتے ہیں جو خود کو سجاتی ہے لیکن اپنے محبوب کا انتظار کیے بغیر سو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مشک کی خوشبو کھو جاتی ہے اور ہینگ کی بھاری بدبو کے سوا کچھ نہیں بچتا۔ دوسرے الفاظ میں، جو شے خدا کی نظر میں مقبول ہے وہ ہے انسان کا اندرونی لگاؤ۔ باہری رسوم اور دکھاوا مردود ہیں۔ مندرجہ ذیل اشلوک میں ان باہری رسوم اور دکھاوے کا موازنہ حسینہ کے بناؤ سنگار سے کیا گیا ہے۔ ایک طرف اس کا خارجی بناؤ سنگار ہے اور دوسری طرف حقیقی لگاؤ۔

وہ نہائی، خود کو خوشبوؤں سے معطر کیا
اور سج سنور کر بے فکری سے سو گئی
لیکن ہینگ کی بدبو ہی اس میں باقی رہ گئی
اور مشک کی ساری خوشبو چلی گئی۔

زندگی کی ناپائداری، محلوں اور حکومتوں کی فناپذیری اور حسن کی بے ثباتی کے ذکر کے بعد بابا فرید ہمیں ان اشغال کے ترک کرنے کی اہمیت کی طرف لے چلتے ہیں جن سے کوئی روحانی فائدہ نہیں پہونچتا :

فرید، ان مشغلوں کو ترک کر دو
جن سے کوئی فائدہ نہیں
ورنہ کہیں خدا کی بارگاہ میں
تمہیں شرمندہ نہ ہونا پڑے

انتہائی طنز کے ساتھ وہ ان احمقوں کو نگاہ تحقیر سے دیکھتے ہیں جو اپنے کیے کا انجام سوچ نہیں سکتے :

فرید، جاٹ کیکر کا پیڑ لگاتا ہے
لیکن وہ پھل چاہتا ہے بجور کے انگوروں جیسے
وہ کاتتا تو اون ہے
لیکن پہننا چاہتا ہے ریشم

اس میں کوئی شک نہیں کہ فرید اس پرانی کہاوت پر زور دیتے ہیں " جیسا بوؤگے ویسا کاٹوگے" لیکن بالآخر صوفی ہونے کے باعث، وہ اس بات پر بھی اصرار کرتے ہیں کہ جب تک انسان دنیاوی طور طریقے نہیں چھوڑ دیتا اور ان رشتوں پر حاوی نہیں ہو جاتا جنھوں نے اسے دنیاوی مال ومتاع سے باندھ رکھا ہے وہ اس راستے پر نہیں چل سکتا جو روحانی سکون تک پہنچتا ہے۔ خدا کی محبت بھری عبادت (بھگتی) ہی انسان کو دنیا کی اس آگ میں جلنے سے بچا سکتی ہے جو یہاں پوشیدہ ہے :

مجھے معلوم نہیں کہ میں کیا کروں
یہ دنیا اندر ہی اندر سلگتی ہوئی آگ ہے
میرے مالک نے مہربانی کی کہ مجھے بچا لیا
ورنہ میں بھی جل گیا ہوتا

بابا فرید سچے درویش ہیں۔ اور درویش کی طرز زندگی نے ہی انھیں نیا راستہ دکھایا، تیاگ عبادت اور مراقبے کا راستہ جس نے انھیں دنیا کی آتشِ دروں سے بچایا۔ لیکن بابا فرید یہ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ دنیا سے اپنے کو الگ کھینچ لینا اور اپنے سب رشتے اس سے توڑ لینا آسان نہیں۔

یہ دنیا ہر پل ہمارے ساتھ ہے اور اس کو ترک کر دینا اور درویش کی زندگی اختیار کر لینا ارادہ کی ایسی پختگی اور ہمت چاہتا ہے جو بہت کم لوگ اپنے اندر مجتمع کر سکیں گے :

فرید، چونکہ میں دنیا کی راہ چلتا ہوں
اس لیے مشکل ہے کہ خدائی بارگاہ پر
درویش کی شکل میں پہنچوں
میں نے دنیا داری کا پلندہ باندھ کر لا دیا ہے
میں اس کو پھینکنے کے لیے کدھر جاؤں ؟

بابا فرید کو یہ بھی معلوم ہے کہ بہت سارے لوگ درویش کا روپ اختیار کر لیتے ہیں لیکن اپنے دلوں میں بسی ہوئی نفرت اور کینے سے چھٹکارا نہیں پا سکتے۔ وہ ان درویشوں کی بڑی واضح تصویر کھینچتے ہیں جو اپنے کندھوں پر جائے نماز لٹکائے، صوفی فقیروں جیسے گہرے رنگ کے اونی لباس پہنے، میٹھے الفاظ بولتے ہیں، لیکن ان کے دلوں میں نفرت کی چھریاں چھپی رہتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ کینہ پرور اور بدبخت ہیں اور لوگوں کے بیچ میں اختلافات اور جھگڑے پیدا کرتے ہیں۔ بظاہر تو وہ بہت خداترس اور نیک معلوم ہوتے ہیں ان کے دل تیرہ و تار ہیں۔ جھوٹے اور بناوٹی فقیر سے بڑھ کر گھناؤنی کوئی چیز نہیں ہے :

فرید: لوگ جائے نماز اپنے کندھوں پر لٹکائے پھرتے ہیں
صوفی کے لباس پہنتے ہیں اور میٹھے بول بولتے ہیں
لیکن ان کے دلوں میں چھریاں چھپی ہیں
بظاہر وہ بڑے نورانی معلوم ہوتے ہیں
لیکن ان کے دلوں میں گہرا اندھیرا ہے

ایک اور اشلوک میں بھی بابا فرید اسی بات پر اصرار کرتے ہیں: کالے لباس سے کوئی فقیر نہیں بنتا اگر تمہارا دل گناہ سے بھرا ہوا ہے تو چاہے کوئی بھی لباس پہن لو تم درویش نہیں بن سکتے :

فرید، میرے کپڑے کالے ہیں، کالا ہے میرا خرقہ
میں دربدر پھرتا ہوں، گناہ سے آلودہ لیکن
لوگ مجھے درویش کہتے ہیں

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فرید ان سیاہ اونی کپڑوں کے خلاف ہیں جو صوفی فقیر عموماً پہنتے تھے۔

اور نفس کشی کرنے والوں کا لباس تھا۔ دنیا کی دولتوں کو ترک کرنے کی علامت تھا۔ یہ سادگی اور غریبی کی نمائندگی کرتا ہے۔ قیمتی ریشمی کپڑے اتار کر صوف کو پہن کر درویش کو عبادت خدا میں زیادہ سہولت ملتی ہے۔ بابا فرید اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہمیں اپنے دلوں کی شمعیں روشن کرنی چاہیئے اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ایسا صرف درویش کی زندگی اختیار کر کے ہی ہو سکتا ہے:

فرید! اپنی صدری کو چیتھڑا کر ڈالو اور اس کے بدلے
کمبل اوڑھ لو، ایسا لباس پہنو جس سے
تم خدا کے نزدیک آسکو

آخر کوئی شخص درویشی کی زندگی کیوں اختیار کرتا ہے؟ وہ بہت سخت زندگی ہے اور کبھی نہ ختم ہونے والی جستجو سے عبارت ہے۔ اس سے دل میں ایک طرح کی بھوک پیدا ہوتی ہے جس کی تسکین کبھی نہیں ہوتی۔ یہ بھوک دنیا کی دولت کے ذریعہ کم نہیں ہوتی بلکہ وہ دولت کسی وجہ سے اپنا سارا سحر اپنی ساری اہمیت کھو بیٹھتی ہے۔ ظاہری دنیا ایسی لگتی ہے جیسے ایک چھلکا، ایک خالی پرچھائیں ایک وقتی ڈراما جس کی کوئی مستقل قدر و قیمت نہیں ہے۔ اندر سے ایک مجبور کر دینے والی خواہش جاگتی ہے جو تشفی مانگتی ہے۔ اس کو دبایا نہیں جا سکتا۔ زندگی کے مقصد اور معنویت کا لازوال سوال بار بار فوارے کی طرح اٹھتا ہے اور پوری ہستی پر چھا جاتا ہے، اس میں رچ جاتا ہے۔ اس دنیا اور اس کے بعد کی دنیا کا پر اسرار وقوعہ دماغ میں الجھن پیدا کرتا ہے اور روحانی سکون کو پارہ پارہ کرتا ہے۔ سوالات ایک کے بعد ایک امڈتے چلے آتے ہیں۔ آخر وہ کیا ہے جو جسم میں حرکت پیدا کرتا ہے؟ کیا وہ کوئی مستقل شے ہے؟ کوئی ایسی چیز ہے جو موت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے جب جسم باقی نہیں رہ جاتا؟ کیا روح یا آتما کا پرماتما یا برہمن سے کوئی رشتہ ہے، اس پرماتما سے جس نے دنیا بنائی؟ یا یہ دنیا محض ایک پرچھائیں ہے، محض مایا ہے؟ اور موت بے ہوشی کی پر مسرت کیفیت؟ ہرگز نہیں، ان سوالات کے جواب تو برسوں پہلے ویدانتی فلسفیوں نے اپنشد میں فراہم کر دیئے تھے اور اس وقت سے وہ نسلاً بعد نسلٍ ہم تک پہنچے ہیں اور ہماری تہذیب، ہمارے طرز فکر کا ایک حصہ بن گئے ہیں۔ برہدرانیک اپنشد (Brihadarayanka Upanishad) میں جب شاگرد نے یگنا ولکیا سے پوچھا کہ "اس برہمن کی حقیقت سمجھاؤ جو فوری طور پر موجود ہے اور فوری طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے، جو سب چیزوں کا نفس ہے۔" تو جواب تھا "وہ تم خود ہو اور تمہارا وجود سب میں موجود ہے۔" اور چندو گیا اپنشد میں اُدالکا اپنے بیٹے سویتا کیتو سے کہتا ہے "وہ جو کہ ایک لطیف جوہر ہے، اس پوری کائنات کا

نفس ہے، وہی سچ ہے اور وہی وہ وجود انسانی ہے جو تم ہوا ہے سوتیا کیتو!" مختلف ذریعوں سے یہ وراثت درویشوں کو پہنچی ہے چاہے ان کا کوئی بھی دینی پس منظر ہو۔ ہر چیز پر مستولی اس پرماتما کی موجودگی کا احساس ان کو اپنے اندر ہوتا ہے اور وہ اس عالمی روح کے ساتھ وحدت حاصل کرنے کی جستجو میں رہتے ہیں۔ یہ تلاش ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی، یہ وہ بھوک ہے جو کبھی سیر نہیں ہوتی۔

بابا فرید بھی ان لوگوں میں سے تھے جو اس حقیقت کی تلاش میں تھے اور اس وحدت کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے وہ برضا و رغبت خود کو ان لوگوں پر نچھاور کرتے جنھوں نے ترک دنیا کر کے جنگلوں میں تپسوی کی سخت زندگی اختیار کر لی تھی اور جو اپنا ہر لمحہ خدا کے ازلی وجود کے حضور میں گزارتے تھے:

فرید، میں قربان جاؤں ان پرندوں پر
جو جنگلوں میں رہتے ہیں
وہ پھل کھاتے ہیں اور زمین پر سوتے ہیں
لیکن اپنے خدا کو نہیں چھوڑتے

خدا کے لیے محبت اور چاہت کا یہ جذبہ "طریقت" کو جنم دیتا ہے۔ طریقت سے مراد ہے وصول الی اللہ کا صوفیانہ طریقہ۔ صوفیوں کے لیے محبت کا جذبہ روحانی تجربے کی بنیاد ہے۔ اسی لیے وہ عشق الٰہی کو شریعت کے پاک اصولوں سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ عشق الٰہی اس دنیا کو ترک کرنے اور اس کو رد کرنے پر مبنی ہے۔ یہ عشق باقی ہر چیز کو مسترد کرتا ہے اور وہ کسی اور شے سے لگاؤ کی اجازت نہیں دیتا۔ فارسی شعرا کی طرح بابا فرید بھی عشق الٰہی کے اظہار کے لیے انسانی محبت کی تشبیہات استعمال کرتے ہیں۔ خدا عاشق ہے اور فرید معشوق اور یہ رشتہ تمام پہلوؤں سے پیش کیا جاتا ہے: عاشق کے لیے تڑپنا، دردِ ہجر، سفر کے شدائد عزیز رکھی جانے والی ہر چیز کی بخوشی قربانی، ان مختلف طریقوں کا ذکر جو عورت خود کو عاشق کے لائق بنانے کے لیے اپناتی ہے اور آخر میں جذباتی اور ازلی اتصال کی منزل۔ صوفی کے لیے "عشق" اور "بھگتی" ایک ہی معنی رکھتے ہیں۔

بابا فرید کو جس وحدت اور وصل کی آرزو تھی اسے حاصل کرنے کے لیے انھوں نے اپنی پوری زندگی زہد اور نفس کشی میں گذاری۔ وہ اپنے درد اور محرومی کے بے پناہ احساس کا اظہار کرتے ہیں کہ ان بے انتہا اذیتوں کے باوجود جو انھوں نے خود اپنے جسم روا رکھی تھیں اور جو ہڈی کا محض ایک ڈھانچا بن گیا تھا، خدا نے ان کو اپنے حضور سے نہیں نوازا:

فرید، میرا اسو کھا ہوا جسم ہڈی کا ڈھانچہ بن گیا ہے

کوے میری ہتھیلی اور تلوؤں پر چونچ مارتے ہیں

ابھی تک اللہ تعالیٰ میری مدد کو نہیں آئے

اللہ کے اس بندے کی بدقسمتی تو دیکھو

لیکن ان شدائد نے خدا پر ان کے اعتقاد کو کم نہیں کیا۔ وہ کسی اور دروازے پر رحم وکرم کی بھیک مانگنے کو تیار نہ ہو سکتے تھے۔ کسی اور پر بھروسہ کرنے کے بجائے وہ مر جانا بہتر سمجھتے اگر اللہ کی مرضی یہی تھی کہ وہ اس طرح کا رویہ روا رکھے تو اس سے بہتر تھا کہ وہ انھیں اس دنیا سے اٹھا لیں:

فرید کہتے ہیں، اے خدا مجھے کسی اور کے دروازے پر

بھیک مت مانگنے دے

اگر تو اسی طرح کا برتاؤ مجھ سے کرنے والا ہے

تو میرے جسم سے جان نکال لے

بابا فرید اپنے عاشق کے لیے تڑپتے ہیں اور جدائی کے کبھی نہ ختم ہونے والے درد کو برداشت کرتے ہیں۔ لیکن اس تڑپ اور اس درد کو وہ بخوشی قبول کرتے ہیں کیونکہ ان کے ذریعہ محبت کی آگ روشن رہتی ہے۔ وہ درد عشق کی تشبیہ اس بادشاہ سے دیتے ہیں جو جسم پر مکمل حکومت کرتا ہے، ایسے درد کے بغیر زندگی دوزخ کے مانند ہے۔ محبت سے بھرپور زندگی، درد کے باوجود شاہانہ ہے، جب کہ محبت کے بغیر جینا شمشان گھاٹ کے مانند ہے یا بس موت ہی ہے:

لوگ مستقل درد عشق کا ذکر کرتے ہیں

اے عشق تو بادشاہ ہے

فرید، اس جسم کو جس میں محبت کی

ایک بھی ٹیس نہ ہو شمشان گھاٹ سمجھو

دل کو چھو لینے والے ایک اشلوک میں بابا فرید اپنے محبوب کے فراق میں اپنا حال یوں بیان کرتے ہیں:

فرید، تڑپ میرا پلنگ ہے، درد میری نواڑ

اپنے محبوب سے جدائی میری چادر ہے

ایسی ہے میری زندگی

میرے رب مجھ پر اپنے رحم کی نظر ڈال۔

یہ واضح ہے کہ بابا فرید آرزو اور ہجر کو روحانیت حاصل کرنے کے لیے لازمی سمجھتے ہیں۔ یہ وہ ذرائع ہیں جن سے خدا سے رحم حاصل کرنے کی امید کی جاتی ہے۔

اپنے محبوب کے لیے عورت کی تمنا کی تشبیہ بابا فرید برابر استعمال کرتے ہیں۔ اور بچھڑے ہوئے محبوب کے درد بھرے جینے کی منظر کشی کرتے ہوئے حسب حال سوال پوچھتے ہیں کہ ان عورتوں کی کیا حالت ہوگی جن کے شوہروں نے ان سے منہ موڑ لیا ہے؟

میں کل رات اپنے محبوب کے ساتھ نہیں سوئی
میرا جسم گھلا جا رہا ہے
جاؤ جا کر اس عورت سے پوچھو جس کے شوہر
نے اسے چھوڑ دیا ہے
وہ رات کیسے گزارتی ہے؟

اس بند میں بابا فرید کا اسلوب بہ یک وقت خبریہ اور انشائیہ ہے۔ لیکن کسی بھی فن کا مقصد چاہے وہ شاعری ہو، ڈراما ہو یا مصوری ہو، سوال پوچھنا نہیں یا بیان دینا نہیں ہے بلکہ ایک جذباتی ردعمل پیدا کرنا اور احساسات سے بھری لیکن لطف اور گرفت میں نہ آنے والی زندگی کے ان احساسات کا اظہار کرنا ہے جو عام طور پر بیان نہیں کیے جا سکتے۔ یہاں "احساسات" سے وہ مکمل تجربہ مراد ہے جو مندرجہ بالا اشلوک میں در آیا ہے۔ شاعر ایک ایسی عورت کی تصویر کشی کرتا ہے جس کا جسم خدائی کے غم میں گھل رہا ہے، ایک ایک عضو درد سے اینٹھ رہا ہے۔ اور جیسا کہ مندرجہ بالا اشلوک میں دکھایا ہے خود پلنگ اور چادر درد کی علامت بن گئے ہیں۔ یہ تڑپ خدا سے ایک رات کی جدائی کا نتیجہ ہے اور صوفی کے لیے فطرتاً وہ سوال بہت اہمیت حاصل کر لیتا ہے جو کہ پوچھتا ہے کہ ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جنھیں ان کے محبوب نے مستقل طور پر رد کر دیا ہو؟ اس اذیت کی سنگینی تخیل کو دہلا دیتی ہے۔ اسی لیے فرید ایسے جینے کا موازنہ شمشان گھاٹ سے کرتے ہیں اور خدا سے رحم کی درخواست کرتے ہیں۔ اور خدا سے رحم کی درخواست کرتے ہیں۔

ایک اور اشلوک میں فرید عورت کے اسی طرح کے تجربات کا ذکر کرتے ہیں، جس کا جسم درد سے ٹوٹ رہا ہے اور جدائی کی رات لامتناہی معلوم ہوتی ہے:

فرید رات لمبی ہو گئی ہے اور میرا بدن
درد سے ٹوٹ رہا ہے

پھٹکار ہے ان لوگوں کی زندگیوں پر
جو خدا کے علاوہ کسی اور کا سہارا رکھتے ہیں

"راگ سوہی" میں بابا فرید بے حد حساس اور جذبات سے بھرپور اسلوب میں اس عورت کی تصویر کھینچتے ہیں جو اپنے محبوب سے بچھڑ گئی ہے:

میں اپنے ہاتھ ملتی ہوں، اور اپنے مالک سے
جدائی کی آگ کے درد میں جلتی ہوں
میں اپنے شوہر کی آرزو میں پاگل ہو گئی ہوں
تو، اے میرے شوہر، اپنے دل میں مجھ سے ناراض تھا
یہ میرے ہی عیوب کی وجہ سے تھا
تمہاری غلطی نہ تھی

جدائی کی آگ میں جل کر خاک ہو جانے والی اور اپنے محبوب کی آرزو میں پاگل عورت کے تصور سے فرید اور آگے بڑھتے ہیں اور کوئل کو بھی جدائی کی آگ میں جلتا ہوا قرار دیتے ہیں۔ کوئل رات بھر پکارتی ہے اور اس کا رنگ جدائی کے غم میں سیاہ ہو گیا ہے۔ علامت اور تشبیہ بے حد لطافت کے ساتھ استعمال کی گئی ہیں۔

اے سیاہ پروں والی کوئل، تجھے کس نے کالا کیا؟
محبوب سے جدائی کے غم نے میرے پر جلا کر کالے کر دیے۔

سادہ الفاظ میں شاعر کوئل سے پوچھتا ہے "تو کیوں کالی ہے؟" اور کوئل جواب دیتی ہے "میں اپنے محبوب کی جدائی میں جل کر کالی ہو گئی ہوں"۔ ان دو انتہائی سادہ لیکن لطیف سطور میں شاعر نے پوری زندگی کا درد بھر کر رکھ دیا ہے۔

سچے محبوب کی طرح بابا فرید بھی اپنے مالک کے ساتھ اتصال حاصل کرنے کے لیے کوئی بھی قربانی دینے کو تیار ہیں۔ حسن، خدا کی عظیم نعمتوں میں سے ایک ہے اور بابا فرید کو معلوم ہے کہ ہر عورت حسن کو ہر چیز سے زیادہ پیارا سمجھتی ہے۔ لیکن بابا فرید ایک عارف ہیں اور بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ سچا پیار حسن سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ عشق پائدار ہو سکتا ہے لیکن حسن فنا پذیر ہے۔ اور عاشق کی سراہنے والی نگاہوں کے بغیر حسن کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ محبت کے بغیر حسن زندہ نہیں رہ سکتا، وہ بس مرجھا جاتا ہے:

مجھے حسن کے چلے جانے کا خوف نہیں ہے
اگر میرے شوہر کا پیار اس کے ساتھ نہ جائے
فرید، کتنی بار عشق کے بغیر
حسن مرجھا کر سوکھ گیا ہے۔

اپنے دو بہت مشہور اشلوکوں میں بابا فرید برستے ہوئے پانی میں محبوب کے گھر تک جانے کے سفر کا ذکر کرتے ہیں۔ ان اشلوکوں میں روحانی شاعری کا مزا ہے، خاص طور پر ان عظیم محبت کی داستانوں کا جن کے گیت پنجاب میں گھر گھر گائے جاتے ہیں۔ راستہ لمبا ہے، گلیاں کیچڑ سے بھری ہیں اور اگر وہ جائیگا تو بارش میں اس کے کپڑے بھیگ جائیں گے۔ مگر وہ رک جائے گا تو اس کا پیار ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگا وہ خدا کی بارش سے پکار کر کہتے ہیں کہ جتنا برس سکتی ہے برسے، وہ تو اپنے محبوب سے ملنے جائینگا ہی تاکہ اس کی محبت زندہ رہے۔ روحانی اصطلاح میں بابا فرید یہ بتانا چاہتے ہیں کہ عشق کا راستہ لمبا اور مشکل ہے اور اگر سچا طالب ترک دنیا اور ریاضت سے جو عشق خدا کا تقاضا ہے، ہار جاتا ہے تو وہ اس وصال سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے جس کی اس کو تلاش اور آرزو ہے۔ وہ لوگ جو اپنے اعتقاد میں پکے نہیں ہیں اور ان رکاوٹوں پر غالب نہیں ہو سکتے جو ان کی منزل کی راہ میں آتے ہیں ان کے لیے کوئی امید نہیں ہے۔ یہ چڑھائی بہت اونچی ہے اور صرف وہی سچے طالب محبوب کے ساتھ اتصال حاصل کر سکیں گے جو دنیاوی املاک کو ترک کر دیں گے۔ دوسرے اشلوک میں بابا فرید ڈرامائی انداز میں آندھی کو پکارتے ہیں اور بارش کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی پوری طاقت سے برسے، کیونکہ ایسا کر کے بھی وہ انھیں اپنے ارادہ سے نہیں ہلا سکتیں۔ وہ کسی قسم کی مشکل یا قربانی کے خوف سے پیچھے ہٹنے والے نہیں تھے۔ وہ اپنے اعتقاد کے پکے ہیں اور انھیں اپنے محبوب کا وصل حاصل کرنے کی سعی میں کامیابی کے بارے میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہ طریقت ہے۔ نہایت جیتے جاگتے لیکن متصوفانہ الفاظ میں لپٹی ہوئی:

سڑکیں کیچڑ سے آلودہ ہیں
اور میرے محبوب کا گھر دور ہے
لیکن مجھے اپنے مالک سے محبت ہے
اگر میں بارش میں باہر نکلوں
تو میرا کمبل بھیگ جائے گا، اگر

میں رک جاتا ہوں تو اپنی محبت کو کھو بیٹھتا ہوں
اس لیے میرے کمبل کو خدا کی بھیجی ہوئی بارش میں
بھیگ جانے دو
لیکن مجھے اپنے محبوب سے ملنا ہے
کہیں یہ رشتہ ٹوٹ نہ جائے اور میں کھو نہ جاؤں

اسی سے ملتے جلتے انداز میں بابا فرید ایسے حالات میں بھی اپنے محبوب سے ملنے کے مصمم ارادہ کا اظہار کرتے ہیں جب کہ ان کا بدن تنور کی طرح گرم ہو اور ان کی ہڈیاں لکڑی کی طرح جل رہی ہوں۔ یہ اشلوک مقصد کی پختگی اور پرجوش عقیدے کی وحدت کا اظہار کرتا ہے۔ اس راہ میں کسی شے کو رکاوٹ بن کر آنے کی اجازت نہ ہوگی۔ سالک اپنی جستجو برابر جاری رکھے گا اور اگر اس کے پاؤں تھک جائیں گے تو وہ اپنے سر کے بل چلے گا۔ اس قسم کی سادہ اور گھریلو تشبیہوں کا استعمال کرتے ہوئے بابا فرید اپنے گہرے سے گہرے جذبات اور محبوب کے لیے اپنے لگاؤ کا اظہار کرنے میں کامیاب رہتے ہیں:

میرا جسم تنور کی طرح گرم ہے، میری
ہڈیاں لکڑیوں کی طرح جلتی ہیں
اگر میرے پاؤں تھک گئے تو میں سر کے بل چلوں گا
اپنے محبوب سے ملنے کے لیے

ریاضت اور بے پناہ نفس کشی کے اتنے سال کاٹنے کے بعد بابا فرید اس منزل پر پہنچ گئے جب انھیں ایسا محسوس ہوا کہ وہ خدا کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ ان کا مادی جسم ان کے حرکات کا کوئی اہم حصہ نہ رہا۔ انھیں محسوس ہوا کہ وہ ایک لطیف جوہر اور روح بن کر رہ گئے ہیں۔ بالواسطہ انداز میں انھوں نے ایسے مقام وجود کی تصویر کشی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ان کے جسم کو کاٹا جائے تو اس میں سے خون نہیں نکلے گا۔ کیونکہ جو لوگ خدا کی محبت میں گرفتار ہیں ان کی رگوں میں خون نہیں ہوتا۔ دوسرے الفاظ میں ان کا پورا وجود خدا کے عشق کے جذبے سے رچا ہوا ہوتا ہے:

اے فرید اگر کوئی سچے طالب کے جسم کے ٹکڑے کرے
تو ایسا معلوم ہوگا کہ اس کے بدن میں ایک بوند خون نہیں ہے
ہاں، وہ جو کہ خدا کے عشق میں شرابور ہیں

ان کا خون آہستہ آہستہ سوکھ چکا ہے

روحوں کی صورت حال کا ذکر دو اشلوکوں میں کیا گیا ہے جہاں روح کو ایک ہنس کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، ہنس جو کہ پاکیزگی کا مجسمہ ہے، تالاب پر اترنے کے بعد بھی گندے پانی میں چونچ نہ ڈالے گا۔ دوسرے الفاظ میں وہ روحیں جو عشق خدا میں شرابور ہیں، جب اس دنیا میں آتی ہیں تب بھی وہ دنیا کے گناہوں میں آلودہ نہیں ہونے پاتیں اور ان کے دل میں ہمیشہ اپنے اصلی وطن کو واپس جانے کی تمنا موجود رہتی ہے۔ دوسرے اشلوک میں بابا فرید جو کے کھیتوں پر ہنس کے جھنڈ اترنے کا منظر کھینچتے ہیں۔ لوگ ہنسوں کو مار بھگاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ ہنس موٹا اناج نہیں کھاتا۔ یہاں پر بابا فرید دوبارہ اس نکتہ پر زور دیتے ہیں کہ درویش دنیاوی دولت میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ صرف بے وقوف اور بے عقل لوگ اس بات کو سمجھ نہیں پاتے اور اس کے ارادوں پر شک کرتے ہیں۔ ان دونوں اشلوکوں میں ان لوگوں کی روحانی کیفیت پر زور دیتے ہیں جنھوں نے دنیا کو ترک کر دیا ہے اور خدا کے ساتھ اتصال کی تلاش میں ہیں:

ہنس کھاری پانی کے چھوٹے سے تالاب پر اترے ہیں
وہ اپنی چونچ پانی میں ڈالتے ہیں لیکن پانی
نہیں پیتے
انھیں تو اڑ جانے کی پیاس ہے

اور:

ہنس جو کے کھیت پر اترتا ہے اور لوگ
اس کو بھگانے کے لیے دوڑتے ہیں
لیکن بے وقوف لوگوں کو نہیں معلوم
کہ ہنس موٹا اناج نہیں کھاتا

بابا فرید نے دنیا چھوڑ دی تھی اور اپنی روح کو نفس کشی اور تا حیات خدا سے لگاؤ کے ذریعہ پاکیزہ کیا تھا اور اس منزل پر پہنچ گئے تھے جب خود کو خدا سے ہم آہنگ محسوس کرتے تھے۔ انھوں نے خدا کے پیار کی مٹھاس کو چکھا تھا جس کو وہ اس دنیا کے سب سے زیادہ میٹھے تحفوں سے بھی کہیں زیادہ لذیذ بتاتے ہیں:

میٹھی ہے برفی اور شکر اور شہد

کی تینوں منزلوں کا امتزاج ملتا ہے۔

بابا فرید کوئی خشک نظریاتی فلسفی نہیں تھے۔ لہٰذا انھیں اس بات سے کوئی مطلب نہ تھا کہ ان منازل کو طے کرنے میں کتنی دیر لگتی ہے اور وہ کس طرح طے ہوتی ہیں۔ وہ روحانی انسان تھے اور زندگی گزارنے کا ایسا طریقہ پیش کرنا چاہتے تھے جو وصول الی اللہ کی منزل تک پہنچا سکے۔ بابا فرید کو انسان کے دکھ درد اور تکلیفوں کا شدید احساس تھا اور ان کا درد مند دل ایک ایسا اخلاقی اور روحانی حل ڈھونڈنا چاہتا تھا جو انسان کو اپنی نکبت پر فتح حاصل کرنے میں مدد کرے۔ دوسرے اولیاء اللہ اور مذہبی رہنماؤں کی مانند بابا فرید بھی سمجھتے تھے کہ انسان کا دکھ خود انسان کے دنیاوی عیش و دھن دولت سے لگاؤ کے باعث ہے۔ یہ لگاؤ لالچ اور گناہ سے بھری زندگی کی طرف لے جاتا ہے۔ اور بابا فرید کے مطابق انسان کے افعال کا فیصلہ آنے والی زندگی میں ہوگا جب انسان کو اس کے گناہوں کی سزا ملے گی۔ یہ سزا بہت بھیانک ہوگی کیونکہ جب گھنٹہ اور کا غذ اور روئی جیسی معصوم چیزوں کو اتنی بے دردی سے سزا ملتی ہے تو پھر گنہ گاروں کے لیے کیا سزا ہوگی؟ بابا فرید یہ بھی جانتے تھے کہ یہ زندگی فانی ہے اور اسی لیے لوگوں کو سمجھاتے تھے کہ وہ "زندگی کے تلوں" کے استعمال میں فضول خرچی نہ کریں۔ وہ موت کی خوفناک تصویریں بار بار کھینچتے ہیں خاص طور سے وہ جس میں موت ایک دولہے کی طرح آتی ہے، جسم کو توڑتی ہے اور روح کو اپنی دولہن کی طرح لے کر چلی جاتی ہے۔ ان طویل برسوں کا بھی وہ ذکر کرتے ہیں جو روح کو قبر میں گزارنے ہیں اور یہ کہ قیامت کے دن کیا ہوگا۔ ان کے کلام میں پاکیزہ زندگی کی ضرورت اور اخلاقی خوبیوں کو اپنے اندر پیدا کرنے کی اہمیت کا ذکر ایک تند دھارا کی طرح جاری و ساری ہے۔ یہ سب چیزیں آخر میں اس راستے کو لے جاتی ہیں جہاں پہلے نفس کشی اور زہد ہے، پھر بھگتی اور پھر عشق الٰہی۔ بار بار فرید حواس کی دنیا کو ترک کرنے اور اپنے دل کے مکمل جوش و قوت کے ساتھ خدا سے لو لگانے پر اصرار کرتے ہیں۔ یہ سفر لمبا ہو سکتا ہے، موسم خراب اور راستہ جوکھم اور خطروں سے بھرا ہوا، لیکن راستے میں کہیں رکنا نہیں ہے۔ اگر تمہارے پاؤں جواب دے جائیں تو اپنے سر کے بل چلو۔ انعام آخرش حاصل ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اگر تم نے اس کو اپنا بنایا ہے تو وہ تمہیں اپنا بنائے گا۔ تم اپنا محبوب' اور یہ دنیا' دونوں کو حاصل کر لوگے۔ تم خدا کی موجودگی کو اپنے دل میں محسوس کروگے اور خدا کی محبت کی مٹھاس پکی ہوئی کھجور اور شہد کی نہروں سے بھی زیادہ میٹھی ہوگی۔ اس کو حاصل کرنے کی ضرورت

اور بھینس کا دودھ

ہاں یہ سب میٹھے ہیں، لیکن ان سے

کہیں زیادہ میٹھا ہے خدا

چونکہ بھگتی کی شکل میں اس کی محبت کا تحفہ بے حد بیش قیمت ہے، اس لیے بابا فرید لوگوں سے درخواست کرتے ہیں کہ اس دنیا میں اپنے قیام کی مقررہ مدت کے ہر دن کا بہتر سے بہتر استعمال کریں۔ ایک اور اشلوک میں فرید اسی خیال کو دہراتے ہیں اور کہتے ہیں:

خدا پکی ہوئی کھجور کی طرح ہے

شہد کے دریا کی طرح ہے

ہاں یہ جان لو کہ ہر دن جو گزرتا ہے

اس زندگی کا ایک دن لے جاتا ہے

یہ دو خیال بابا فرید کے اکثر اشعار میں ساتھ ساتھ چلتے ہیں: انسانی زندگی کا مختصر ہونا اور روحانی تجربے کا بیش بہا ہونا۔ اس تجربے کی اہمیت یا کشش کو عام لوگوں کی فہم سے قریب کرنے کے لیے بابا فرید اس کا موازنہ کھجور اور شہد سے کرتے ہیں:

اور آخر میں سوال اٹھتا ہے کہ بابا فرید نے خدا کو کہاں پایا؟ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، انھوں نے خدا کو اپنے دل میں پایا:

تو کیوں جنگلوں میں بھٹکتا ہے، کانٹوں کو

پیروں تلے روندتا ہوا

خدا تو تیرے اندر بسیرا کرتا ہے

تو کیوں اسے جنگلوں میں تلاش کرتا ہے؟

یہاں بابا فرید کے اشلوکوں میں ''طریقت''، ''معرفت'' اور ''حقیقت''

میں ایک شدت ہے اور وصل میں ایک بے تکلفی ہے جب انسانی روح کو آفاقی روح میں جذب ہو جاتی ہے۔ یہی وہ روحانی تجربہ ہے جس کو ساری زندگی بابا فرید نے اپنے لیے اور دوسروں کے لیے تلاش کیا۔

چھٹا باب

فرید ایک فنکار

بابا فرید دو دنیاؤں میں رہتے تھے۔ ایک تھی قرآن مجید اور "سنت" کی دنیا جو اسلامی شریعت کے مقررہ قواعد کے مطابق زندگی میں سخت باقاعدگی چاہتی تھی، اور دوسری تصوف کی دنیا جہاں وہ حقیقت اخریٰ کے ذاتی اور براہ راست حصول کے خواہاں تھے۔ وہ اپنے والدین سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ اور ان کی طبیعت کا مذہبی میلان اس ماحول سے اور مضبوط ہوا جس میں انھوں نے پرورش پائی۔ وہ بہت بڑے عالم تھے اور اپنا بیشتر وقت علمی اشغال میں گزارتے تھے۔ ان کے مطالعے کا میدان قرآن مجید اور دیگر اسلامی تصانیف تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے شاعری اپنی زندگی کے آخری برسوں میں شروع کی۔ ان کی شاعری میں ایک سخت استاد اور بالغ مفکر کا گہرا رنگ ہے۔ نوجوان شاعر کے تخیل کی اڑان کا نام ونشان نہیں ہے۔ ان کے خیالات ان کے اپنے ذہنی عوامل، مطالعے اور آنے والی زندگی کی بصیرت کا نتیجہ تھے۔ خانقاہ کی دیکھ ریکھ کرنے والے شیخ کی مشغول زندگی کے باوجود، ان کے پاس آنے والے ہر دکھیارے کے دکھ درد سننے کے باوجود، وہ اصلاً تنہا تھے۔ انھوں نے دہلی اور اجودھن چھوڑ دیا کیونکہ وہ خود اپنے آپ کے ساتھ اور اپنے خدا کے ساتھ اکیلے رہنا چاہتے تھے۔ درباروں اور امیروں کی دنیا کو انھوں نے ٹھکرا دیا اور وہ سماجی زندگی سے بھی بڑی حد تک خوش نہیں تھے۔ اس لیے انسانوں کی عام زندگی کے مقابل ان کا ردعمل یہ تھا کہ وہ علیحدگی پسند اور سریت کی داخلی دنیا کی طرف مائل ہو گئے۔ ان کی زندگی کا مقصد تھا خدا کی جستجو، اسی کی تعلیم دینا اور اسی پر عمل کرنا۔ وہ بہ یک وقت ایک بڑا ایک صوفی اور ایک شاعر تھے۔ حالانکہ ان کے "شبد" اور اشلوکوں کی تاریخی ترتیب کا اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن انھیں بہ آسانی دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک کا تعلق "شریعت" سے اور دوسرے

ہیں ایک شدت ہے اور ''وصل'' ہیں ایک بے تکلفی ہے جب انسانی روح کائناتی روح میں ضم ہو جاتی ہے۔ یہی وہ روحانی تجربہ ہے جس کو ساری زندگی بابا فرید نے اپنے لیے اور دوسروں کے لیے تلاش کیا۔

چھٹا باب

فرید ایک فنکار

بابا فرید دو دنیاؤں میں رہتے تھے۔ ایک تھی قرآن مجید اور "سنت" کی دنیا جو اسلامی شریعت کے مقررہ قواعد کے مطابق زندگی میں سخت باقاعدگی چاہتی تھی، اور دوسری تصوف کی دنیا جہاں وہ حقیقت اخریٰ کے ذاتی اور براہ راست حصول کے خواہاں تھے۔ وہ اپنے والدین سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ اور ان کی طبیعت کا مذہبی میلان اس ماحول سے اور مضبوط ہوا جس میں انھوں نے پرورش پائی۔ وہ بہت بڑے عالم تھے اور اپنا بیشتر وقت علمی اشغال میں گزارتے تھے۔ ان کے مطالعے کا میدان قرآن مجید اور دیگر اسلامی تصانیف تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے شاعری اپنی زندگی کے آخری برسوں میں شروع کی۔ ان کی شاعری میں ایک سخت استاد اور بالغ مفکر کا گہرا رنگ ہے۔ نوجوان شاعر کے تخیل کی اڑان کا نام ونشان نہیں ہے۔ ان کے خیالات ان کے اپنے ذہنی عوامل، مطالعے اور آنے والی زندگی کی بصیرت کا نتیجہ تھے۔ خانقاہ کی دیکھ ریکھ کرنے والے شیخ کی مشغول زندگی کے باوجود، ان کے پاس آنے والے ہر دکھیارے کے دکھ درد سننے کے باوجود، وہ اصلاً تنہا تھے۔ انھوں نے دہلی اور اجودھن چھوڑ دیا کیونکہ وہ خود اپنے آپ کے ساتھ اور اپنے خدا کے ساتھ اکیلے رہنا چاہتے تھے۔ درباروں اور امیروں کی دنیا کو انھوں نے ٹھکرا دیا اور وہ سماجی زندگی سے بھی بڑی حد تک خوش نہیں تھے۔ اس لیے انسانوں کی عام زندگی کے مقابل ان کا ردعمل یہ تھا کہ وہ علیحدگی پسند اور سریت کی داخلی دنیا کی طرف مائل ہو گئے۔ ان کی زندگی کا مقصد تھا خدا کی جستجو، اسی کی تعلیم دینا اور اسی پر عمل کرنا۔ وہ بہ یک وقت ایک پیر، ایک صوفی اور ایک شاعر تھے۔ حالانکہ ان کے "شبد" اور اشلوکوں کی تاریخی ترتیب کا اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن انھیں بہ آسانی دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک کا تعلق "شریعت" سے اور دوسرے

کا "طریقت" سے ہے۔ دوسرے الفاظ ہیں۔ ان دو حصوں کو بابا فرید کی دونوں دنیاؤں سے مربوط کیا جاسکتا ہے۔ وہ شیخ کی تعلیمات کو مجسم کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ایک تنہا روح کی تلاش محبوب، اس کی آرزوں اور تمناؤں کو ظاہری صورت بھی دیتے ہیں۔

بابا فرید اپنے خیالات کے اظہار کے لیے جس زبان کا استعمال کرتے ہیں وہ زیادہ تر ملتانی پنجابی ہے۔ یہ ان کے بچپن کی زبان تھی۔ لیکن اپنے پیغام کی ترسیل عوام الناس تک کرنے کی غرض سے دوسرے فقیروں اور درویشوں سے تبادلۂ خیال کرتے ہوئے سارے پنجاب کی خاک چھاننے کے باعث انھوں نے نہ صرف دوسرے خطوں میں بولی جانے والی پنجابی کے الفاظ اور محاورے سیکھے بلکہ خود ان کی زبان میں ایک پختگی اور ایسی نفاست اور چمک آگئی جس سے ان کی زبان ان کے عمیق تر خیالات و جذبات کی ترسیل کا معیاری ذریعہ بن گئی۔ ان کے زیادہ تر معاصر سادھو سنت "برج" اور "ہندوی" کا استعمال کرتے تھے۔ ان زبانوں کے نہ صرف الفاظ اور محاورے بلکہ ان کا مخصوص انداز اور ان کے آہنگ کا پیچ وخم بھی بابا فرید کے کلام میں نمایاں ہے۔ فارسی میں ان کے فضل و کمال کی وجہ سے ان کی پوری شاعری میں فارسی کے بہت سارے الفاظ بکھرے ہوئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عالم اور شاعر دونوں ہونے کی وجہ سے انھوں نے ایسی مرکب زبان ترتیب دی جو کہ الفاظ، محاوروں اور تشبیہوں میں تونگر تھی اور ان کے خیالات کی زرخیزی اور ان کے انداز کی چستی کو بہ خوبی بیان کرنے کی قوت رکھتی تھی۔ وہ ایک سنجیدہ ادیب ہیں اور ان کا اسلوب ادبی اور نفیس ہے۔ ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ ملتانی پنجابی میں اپنی خاص مٹھاس ہے اور بابا فرید زبان کی اس مٹھاس کا بہ خوبی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ برج میں بھی ایک لطافت ہے اور روزمرہ اور محاورے کا ایک حسن ہے جس کی وجہ سے اس میں آہنگ کا حسن اور نسائی خوبصورتی کی سی بافت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگرچہ بابا فرید نے برج کا کثیر استعمال نہیں کیا ہے لیکن بعض اشعار میں خاص کر "راگ سوہی" کے شبد میں، ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے برج بھاشا کے آہنگ اور اس کی لطیف موسیقی کی بروئے کار رکھتا ہے۔ وہ شبد یوں شروع ہوتا ہے:

میں اپنے ہاتھ ملتی ہوں۔۔۔

جہاں تک سوال فارسی کا ہے تو ان کا زمانہ آتے آتے فارسی کے الفاظ بھی عوامی بولی اور روزمرہ میں مقبول ہو چکے ہوں گے، کیونکہ فارسی الفاظ ان کے فکر اور اسلوب کا داخلی حصہ ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد فارسی لغات اس معیاری پنجابی کا بھی حصہ بن گئے جو بابا نانک اور ان کے جانشینوں نے

استعمال کی ہے۔ لہٰذا یہ بات باعث حیرت نہیں کہ بابا فرید کا بہت سارا کلام بالکل جدید معلوم ہوتا ہے اور بہت سارا کلام ایسا ہے جو ان کے زمانے کی مقامی ملتانی بولی میں ہے۔

بابا فرید کا شعری مزاج غنائی ہے۔ ان کے یہاں تعقلاتی گہرائی اور جذباتی بافت کا امتزاج ملتا ہے۔ ان کے کلام میں ایک واضح نغمگی ہے۔ افسوس ہے کہ اس کے باوجود اس میں غنائیہ شاعری کا جذباتی بے قابو پن نہیں ہے۔ ان کا کلام ایجاز اور مختصر بیانی کا حامل ہے۔ وہ کبھی بھی اپنے جذبات کے تلاطم یا احساس مایوسی کو بے دھڑک اور بے روک ٹوک نہیں بیان کرتے۔ ان کے اندر جو زاہد چھپا ہوا ہے اس کی گرفت ان کے اوپر بہت مضبوط ہے۔ ان کے زیادہ تر اشلوک مثنوی کی ہیئت میں لکھے ہوئے دوہے ہیں، اور صرف چار ایسے ہیں جو مربع یا چوپائی کی ہیئت میں ہیں۔ صرف چار شبد ایسے ہیں جن میں عشق الٰہی یا بے ثباتی دنیا کا مضمون کسی قدر تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ ان کا احساس موسیقی بہت لطیف ہے۔ ان کے کلام کی موسیقی نرم ہوا کی طرح ہمارے اعصاب کو سکون بخشتی ہے۔ لیکن چونکہ ان کے اشلوک محض دو مصرعوں پر مشتمل ہیں اس لیے ان کی موسیقی کو ہمارے ذہن پر پوری طرح اثر انگیز ہونے کا موقعہ نہیں ملتا۔ شاعری کی موسیقی صرف اسی وقت وضاحت سے سامنے آتی ہے جب اس کے آہنگ میں تکرار ہو۔ افسوس کی بات ہے کہ آہنگ کی یہ تکرار بابا فرید کے کلام میں مفقود ہے۔ ان کے اشلوک فکر سے بوجھل ہیں۔ ہر اشلوک اپنی جگہ پر ایک مکمل اکائی ہے اور اس میں کسی ایک خیال یا تجربہ کی پوری وسعت سما گئی ہے۔ وہ اپنے فلسفیانہ خیالات کو جذبات میں ڈھال دیتے ہیں اور تشبیہات اور استعارات کے ذریعہ اپنے مفہوم کی ترسیل ان پڑھ لوگوں تک بھی کر دیتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہر اشلوک ایک مکمل اکائی کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے یہ اشلوک بنیادی حقائق کی شکل میں سامنے آتے ہیں نہ کہ فلسفیانہ اصولوں کی شکل میں۔ ان کے یہاں دردمندی تو ہے لیکن سستی جذباتیت نہیں، اور وہ اکثر شاعر سے زیادہ معلم اخلاق معلوم ہوتے ہیں۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ بابا فرید غیر معمولی حساس مزاج کے شاعر ہیں۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا میلان نغمہ سرائی کی لذت کی طرف اتنا نہیں جتنا تعلیم اور تلقین کی طرف ہے زندگی کے بارے میں ان کا جو رویہ ہے اس کا رنگ ان کے فن میں در آیا ہے۔ فطرت کا حسن انھیں مسحور نہیں کرتا اور نہ جینے کی مسرت ان کے لیے کوئی کشش رکھتی ہے۔ زندگی کی بے ثباتی، دنیا کی ناپائداری، گناہ و ثواب کا مسئلہ، موت کا ازلی حضور اور گناہوں کی سزا جو گنہ گاروں کی منتظر ہے یہ تصورات ان کے ذہن پر شدت سے چھائے ہوئے ہیں۔ لہٰذا فطری بات ہے کہ ان کے کلام کا وہ حصہ

جس میں یہ مضامین برتے گئے ہیں وہ خشک اور معلمانہ لگتا ہے۔ ہاں جب وہ عشق الٰہی کا مضمون بیان کرتے ہیں اور جب وہ عشق حقیقی کو بیان کرنے کے لیے عشق مجازی کے علامات استعمال کرتے ہیں تب ان کے غنائی مزاج کی اصل کیفیت پورے حسن کے ساتھ واضح ہوتی ہے۔

بابا فرید اپنے کلام میں دیہات کی زندگی کی تشبیہات اور پیکر استعمال کرتے ہیں۔ وہ زندگی کو دولہن اور موت کو دولہا قرار دیتے ہیں، زندگی کی محدود مدت کو تل کے دانوں سے تشبیہ دیتے ہیں۔ خدا ان کے کلام میں معشوق یا دولہے بلکہ کبھی کبھی زوج (شوہر/ بیوی) کی شکل میں نظر آتا ہے۔ وہ سرمہ لگی آنکھوں، جھیلوں اور تالابوں، جھونپڑوں، کشتیوں، دریاؤں، کیکر کے درختوں، بجور کے انگوروں، کھجوروں اور شہد اور مٹھائی کی طرف ہماری توجہ مبذول کرتے ہیں۔ وہ روح کو ہنس سے تشبیہ دیتے ہیں۔ موت کو شکرے سے اور گم کردہ راہ روحوں کو سارس سے مماثل ٹھہراتے ہیں۔ سزا کا ذکر وہ اس عقوبت کے حوالے سے کرتے ہیں جو گھنٹہ، روئی، کاغذ، بنشکرا اور کوئلے کو بھگتنی پڑتی ہے۔ وہ ان کوؤں اور پربت کاگوں کا ذکر کرتے ہیں جو ان کے خشک بدن پر ٹھونگیں مارتے ہیں وہ اس ہنس کی بات کرتے ہیں جو جھیل پر اترتا ہے اور ان چڑیوں کی کہتے ہیں جنھوں نے جھیل کے کنارے گھر بنایا اور پھر اڑ گئیں۔ وہ دنیا کو ایک خوبصورت باغ قرار دیتے ہیں یا رات کو تقسیم کی جانے والی مشک سے تشبیہ دیتے ہیں۔ زندگی کو وہ پانی کے خوبصورت گھڑے کی طرح پیش کرتے ہیں اور زندگی کی سانس وہ ہی ہے گھڑا جس سے بندھا ہوا ہے۔ وہ اس دوشیزہ کا گیت گاتے ہیں جو شادی کی منتظر ہے اور اس شادی شدہ عورت کی بھی بات کرتے ہیں جس کے اوپر دنیاوی افکار کا بوجھ لدا ہوا ہے۔ جو لوگ با جماعت نماز نہیں پڑھتے انھیں وہ کتا قرار دیتے ہیں۔ وہ ہماری توجہ غاروں اور گڑھوں، پہاڑوں اور میدانوں کی طرف منعطف کر دیتے ہیں جس کے ذریعہ ہمیں ان دیہاتی مناظر کا احساس ہوتا ہے جن کے درمیان وہ رہتے تھے۔

ان کے کلام میں لوہار، ایندھن کی لکڑی، کوئلے، نمک، آٹے، سوکھی اور چپڑی روٹی، نرم اور کھری چارپائیوں، درویشی لباسوں اور سجادوں اور لوگوں کے دلوں میں گھپے ہوئے چاقوؤں کا ذکر ہے۔ وہ ان رئیسوں کے ڈھول نقارے اور چتروں کا ذکر کرتے ہیں جو جلد ہی زمین میں یتیموں کی طرح گاڑے جائیں گے۔ ان کے کلام میں کوئل ہے جو تمام رات کوکتی ہے اور عشق محبوب میں سیاہ پوش ہے۔ وہ اپنے سیاہ لبادے اور جبے کی تحقیر کرتے ہیں کیونکہ انھوں نے درویش کا محض بہروپ بھر رکھا ہے۔ وہ اس عمامے کو نگاہ حقارت سے دیکھتے ہیں جو گندہ ہو جائے گا اور اس سر کو ذلیل سمجھتے ہیں جو خاک میں غلطاں ہوگا۔

ان کے کلام میں ازدواجی زندگی کا حوالہ اکثر ملتا ہے: وہ عورت جو اپنے مطلوب کے ساتھ ہم خواب نہ ہوئی اور جس کا بدن ٹوٹ رہا ہے، وہ عورتیں جنھیں ان کے شوہر ٹھکرا دیتے ہیں، وہ عورتیں جو اپنے معشوق کو فراموش کر کے سو جاتی ہیں اور وہ نیک بی بی جسے اپنے مالک کے سوا کسی کی ضرورت نہیں. بابا فرید موسموں کے تغیر کا بھی ذکر کرتے ہیں. موسلادھار بارشوں کا اور درختوں کے پتے گرنے کا بیان ان کے یہاں ملتا ہے۔ یہ سب اشعار زندگی کی خوشبو سے بھرپور حد تک دولت مند ہیں اور ان کے ذریعہ ہمیں اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ بابا فرید جن لوگوں کے درمیان رہتے تھے ان سے انھیں کتنی محبت تھی اور ان کا وہ کس قدر خیال رکھتے تھے۔ ان کا کلام ان کے زمانے کی دیہی زندگی کی ایک خوبصورت دیوار گیر کے مانند ہے۔

چند چابک دست اشاروں کے ذریعہ بابا فرید حسی پیکروں کا استعمال کرتے ہوئے اپنے کلام میں محاکات برتتے ہیں۔ لیکن ان کی محاکات بصری سے زیادہ تخیلاتی ہے۔ ان کا کلام تخیل کے سرچشموں کو چھو لیتا ہے اور قاری کے ذہن میں تصوراتی رد عمل کی ایک زنجیر پیدا کر دیتا ہے۔ ان کے کلام میں زیادہ تر تصویریں بوجھل اور خوف آگیں ہیں، لیکن بہت سی ایسی بھی ہیں جو محبت کی نرمی سے بھری ہوئی ہیں۔ پہلے ہی اشلوک میں موت کی ایک بھیانک تصویر ہے۔ موت روز مقررہ پر دولہے کے روپ میں روح کی دولہن کو بیاہنے کے لیے آتی ہے۔ موت کا بیان ایک ڈراؤنے زوج کی شکل میں ہے جس کے بارے میں لوگوں نے سنا تو ہے لیکن کسی نے اسے دیکھا نہیں ہے۔ یہ خوفناک دولہا، دولہن کو لے جانے کے لیے آیا ہے۔ وہ بے طاقت جسم کی ہڈیاں پارہ پارہ کرتا ہے اور روح کو نکال لیتا ہے۔ بیچاری روح کو دوزخ کا پل پار کرنا ہے جو بال سے باریک تر ہے۔ کلام کے اثر کو شدید تر کرنے کے لیے شاعر اس خیال کو دہراتا ہے کہ یہ پل بھی ایسا ہے جس کے بارے میں لوگوں نے سنا تو ہے لیکن کسی نے بھی کبھی اس پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ جب بلاوا آتا ہے تو پھر اس سے مفر نہیں۔ موت کی سفاکی، اس کی اذیت اور اس کی ناگزیری کی محاکات انتہائی بے رحمی سے اور بڑے واضح رنگوں میں کی گئی ہے۔

موت کی ایک اور تصویر بھی ہے جس میں وہ ایک فاتح کی طرح آتی ہے اور جسم کے قلعے کو مسمار کر دیتی ہے۔ آنکھوں کے دونوں چراغ روشن ہوتے ہوئے بھی فاتح موت فوجی کیمپ میں داخل ہوتی ہے، قلعہ یعنی جسم کو فتح کرتی ہے، جسم کو اپنے زانو تلے دبا کر اس سے روح کو چھین لیتی ہے اور پھر اپنی راہ لیتی ہے۔ اپنی بصری نوعیت کے باعث یہ انتہائی مہم ناک اور خون خشک کر دینے والی

تصویر ہے۔ بابا فرید نے چند ہی الفاظ استعمال کیے ہیں، لیکن ان کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ موت کے فرشتے کے لیے مَلَک (بادشاہ) جسم کے لیے قلعہ، آنکھوں کے لیے چراغ، اور جسم سے روح کو نکال لینے کے لیے کیمپ کی تاراجی، یہ الفاظ سب مل کر ذہن پر ایسا پیکر بناتے ہیں جو انتہائی دل دہلا دینے والا ہے۔

ایک اور اشلوک میں بابا فرید موت کو شکرے سے تشبیہ دیتے ہیں جو سارس پر جھپٹتا ہے۔ انجام سے بے خبر سارس دریا کے کنارے کلیلیں کر رہا ہے۔ موت کے نمودار ہونے میں جو اچانک پن ہے اور جس تیزی سے جان مارنے کا عمل رونما ہوتا ہے اس سے ہمارے جسم میں لرزہ برپا ہو جاتا ہے۔ لیکن بابا فرید جب زندگی کے اختتام اور موت کے بعد اس سزا کا ذکر کرتے ہیں جو انسان کے انتظار میں ہے تو وہ ہمارے ساتھ کوئی نرمی نہیں کرتے۔ ایک اور اشلوک میں موت کو دریا سے تشبیہ دی گئی ہے جو سیلاب کے جوش میں اپنے کناروں کو بہالے جاتا ہے۔ اور زندگی کے اس پار بھڑکتی ہوئی دوزخ ہے اور گنہ گاروں کی آہ وزاری ہے۔ شاعر اپنے قاری کو ذہنی دھچکا لگانا اور اس طرح جھنجوڑ کر جگانا چاہتا ہے۔ اس وقت ہمارا شاعر استاد کی چھڑی ہاتھ میں لیے ہوتے ہے۔ اور پھر موت کی ایک اور تصویر ہے جب وہ جسم کے تمام دروازوں کو توڑ کر داخل ہوتی ہے اور عزیز و اقارب کے سامنے اپنے شکار کو قیدی بناتی ہے اور سلسلۂ حیات کو منقطع کر دیتی ہے۔ انسان اس دنیا میں بڑی امید کے ساتھ آیا تھا اور اب وہ خالی ہاتھ اور مخزوم چارپائیوں کے کندھے پر سوار یہاں سے رخصت ہوتا ہے۔ بابا فرید اس پر اضافہ کرتے ہیں کہ آخری تجزیہ میں یہی کہا جائے گا کہ اس دنیا میں کی گئی بھلائیاں ہی انسان کے کام آئیں گی۔ اس اشلوک کی اخلاقی تعلیم سے قطع نظر پابہ زنجیر قیدی کی طرح سے روح کی واپسی کی یہ تصویر بڑی روح فرسا ہے۔

ان کے علاوہ دوسری چھوٹے پیمانے پر تصویریں کھنچی ہیں۔ مثلاً اپنے سر پر دنیا داری کا بوجھ ڈھوتا ہوا درویش، یا وہ درویش جو سیاہ لبادے میں ملبوس ہے اور جائے نماز اپنے کندھے پر لٹکائے ہے لیکن اس کے دل میں چاقو چھپے ہوئے ہیں۔ خود ان کی بھی چھوٹی سی تصویر ہے جس میں وہ درویش کے کالے لباس پہنے ہوئے ہیں اور گناہوں سے بوجھل ہیں۔ لیکن درویش کی سب سے عمدہ تصویر جو ہمارے سامنے پیش کی گئی ہے وہ ایسے انسانوں کی ہے جنھوں نے دنیا کو ترک کر کے جنگلوں میں رہنا پسند کیا ہے۔ وہ بے پناہ اذیت اور مصیبتیں اٹھاتے ہیں لیکن عشق الٰہی کی شمع ان کے دلوں میں ہمیشہ روشن رہتی ہے۔

نوجوان عورتوں کی بہت سی تصویریں ہیں جن میں وہ اپنے عاشقوں کا انتظار کر رہی ہیں اور ان کی تمنا میں گھلتی جا رہی ہیں۔ لیکن سب سے اچھی لفظی تصویر وہ ہے جو "راگ سوہی" میں بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ یہ نغمہ جذبات کی گہرائی اور حرارت سے بھرپور ہے۔ بابا فرید کے پورے کلام میں دکھ بھری روح کی یہ شاید سب سے معنی خیز تصویر ہے۔ کرب اور درد کی شدت کے احساسات اس میں بھرے ہوئے ہیں۔ اس میں معشوق سے فراق کے بے پناہ درد اور تڑپ کا اظہار ہے۔ اس میں ایسی عورت کی تصویر پیش کی گئی ہے جو درد ہجر سے اپنا ہاتھ مل رہی ہے اور جس کا جسم جدائی کی آگ میں جل رہا ہے۔ وہ اپنے عاشق کی تلاش میں پاگل ہو گئی ہے۔ لیکن اس میں یہ ہمت نہیں ہے کہ وہ اپنے محبوب پر بے اعتنائی کا الزام لگائے کیونکہ وہ خود اس بات کا اقرار کرتی ہے کہ وہ اپنے محبوب کی وقعت کو نہیں پہچان پائی۔ اس نے اپنا حسن گنوا دیا ہے اور اب اسے اپنی برباد زندگی کا افسوس ہے۔ وہ اس کوئل کے مانند ہے جو اپنے محبوب سے جدائی کی آگ میں جل کر کالی ہو گئی ہے۔ وہ تسلیم کرتی ہے کہ محبوب سے جدا ہو کر کوئی بھی خوش نہیں رہ سکتا۔ خدا کے فضل و کرم سے ہی انسان وصال محبوب حاصل کر سکتا ہے۔

لیکن اس عورت کی حالت کیا ہے؟ وہ ایک گہرے بھیانک کنوئیں میں گر گئی ہے۔ وہ اکیلی ہے اس کا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں، اس تکلیف بھری دنیا میں احساس تنہائی نے اسے اپنے بس میں کر لیا ہے۔ اس کا واحد سہارا یہ ہے کہ اس کا محبوب اس پر اپنے فضل کو ارزاں کر دے۔

روح کو ابھی دوزخ کا پل پار کرنا ہے جو دو دھاری تلوار سے بھی زیادہ تیز اور بہت باریک ہے۔ اس سفر کے لیے روح کو تیاری کرنا ہے۔ اور وہ تیاری اس دنیا میں اس کے قیام کے دوران ہوگی۔ اس دنیا میں تنہا اور پریشان روح کی یہ تصویر بابا فرید نے بہت نرم دلی اور دردمندی سے کھینچی ہے۔ لیکن سب سے نرم اور پیار بھری تصویر کشی اس محبوب کی ہے جسے برستے ہوئے پانی میں لمبی کیچڑ سے بھری سڑک پر چلنا ہے۔ وہ اگر چاہے تو اپنے کمبل کو بھیگنے سے بچا لے یا پھر اپنے محبوب کو کھو بیٹھے۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے محبوب کو کھونے کے بہ نسبت بھیگنا پسند کرتی ہے۔ اور ان دو اشلوکوں میں بابا فرید نے استادانہ انداز میں بے پناہ جذبات بھر ڈالے ہیں۔

دوسرے صوفی شاعروں کی طرح بابا فرید بھی بیوی اور شوہر یا عاشق و معشوق کے انسانی رشتوں کی علامت کا استعمال خدا سے اپنے روحانی لگاؤ کی تصویر کشی کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ جب وہ موت کو دولہا اور روح کو دولہن کہتے ہیں تو بھی وہ عشق مجازی کی علامتوں کا استعمال کرتے ہیں۔ پہلی صورت میں جذبۂ محبت ان کو یکجا کرتا ہے۔ لیکن یہ دونوں موضوع یعنی محبت خدا اور موت کے فرشتے کا خوف نہ صرف بابا فرید کے کلام کے سب سے اہم مضمون ہیں بلکہ ان کی ادائیگی میں وہ اپنی فنکارانہ پختگی اور انسانی مسائل کی گہری سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ عشق الٰہی اور فرشتۂ اجل کا خوف، اپنی فکر کے انھیں دو پہلوؤں کے ذریعہ سرییت کے معنی اور ان کا پیغام ان کے پڑھنے والوں تک پہنچتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے ان علامات کا استعمال عشق حقیقی کے ہر پہلو کی تصویر کشی کے لیے کیا گیا ہے۔

جب ہم بابا فرید کے باقی دوہوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہر دوہا الماس کی طرح اپنی اندرونی روشنی سے منور ہے۔ ہر دوہا فلسفۂ حیات کے کسی پہلو کی مجسم شکل ہے، خود اپنے میں ایک اکائی ہے اور موسیقی سے بھرے فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ بابا فرید معلم اخلاق کی حیثیت سے بھی جب سماجی خوبیوں کی ضرورت اور اہمیت کی تلقین کرتے ہیں تب بھی ان کا مخصوص فنکارانہ رکھ رکھاؤ اور اسلوب کی مٹھاس پوری طرح موجود رہتے ہیں "کیا لالچ اور محبت کبھی یکجا ہو سکتی ہیں؟ اپنے دل سے غصہ اور گھمنڈ نکال دو اور تم ساری جسمانی بیماریوں سے آزاد ہو جاؤ گے اور تمہاری زندگی محبت کی دولت سے بھر جائے گی۔ اگر کوئی تمہیں مارتا ہے تو تم اس کے قدموں کا بوسہ لو۔ اس دنیا کی دولت آنے والی دنیا میں سزا کی طرف لے جاتی ہے۔ اپنی سوکھی روٹی پر قناعت کرو اور لالچ میں مت پڑو۔ اگر تم کیکر کا درخت لگاؤ گے تو کیا تم اس سے انگور کی امید رکھ سکتے ہو؟ اور جب تم اون کاتو گے تو کیا تمہارا ریشمی لباس پہننا ممکن ہو سکتا ہے؟" ان سب اشلوکوں میں نہ صرف زندگی کا اخلاقی پہلو نظر آتا ہے بلکہ انسانیت، انصاف اور محبت کے عمیق جذبات بھی ان میں موجود ہیں اور ساتھ ساتھ روحانی اقدار کے احساس کا زیر یں لہجہ بھی ہے۔ اسی مختصر اور بلیغ انداز میں وہ بڑھاپا، موت، جرم و سزا، جنت و دوزخ، حسن کی بے ثباتی، دولت کا گھمنڈ، زندگی کی ناپائداری اور عشق الٰہی کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ ہر وقت ہمارے سامنے ابدی سچائیوں کو پیش کرتے ہیں اور ان کے اسلوب کی لطافت اور کلام کی موسیقی ان اشلوکوں میں ایک نادر حسن پیدا کر دیتے ہیں۔ اور سب سے

بڑھ کر یہ کہ ان کی شاعری میں جو پیغام ہے وہ بلور کی طرح شفاف ہے اور وہ ہم تک براہِ راست پہنچتا ہے۔ اور جب ہم ان کے اشلوکوں کو گاتے ہیں تو ان کی معنی دماغ میں گھر کر لیتے ہیں اور دھیرے دھیرے اس انسان کی عظمت، اس کی زبان کی مٹھاس، اور اس کی محبت کا خلوص عیاں ہو جاتا ہے۔ وہ ایسے انسان تھے جن کے دل میں محبت اور انسانیت کا جذبہ بھرا ہوا تھا۔

لیکن بابا فرید کی نگاہ میں زندگی رنج و غم کا سرمایہ ہے۔ ان کے زیادہ تر اشلوک انسانی وجود کے تاریک پہلو سے متعلق ہیں۔ دنیا آنسوؤں اور مصیبتوں کی وادی ہے۔ خدا کی بنائی ہوئی دنیا کی خوبصورتی اور جینے کی امنگ کا ذکر ان کی شاعری میں کہیں نہیں ہے۔ وہ زیادہ تر بڑھاپا، موت، زندگی کی ناپائداری اور اس بھیانک سزا کا ذکر کرتے ہیں جو آنے والی دنیا میں گنہ گاروں کو ملے گی۔ لیکن ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ عشقِ الٰہی کا ذکر اپنی شاعری میں غیر معمولی شدت جوش کے جذبے کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان کی محبت اور عقیدت مکمل تھی۔ ولی اللہ اور شاعر، دونوں ہی حیثیتوں سے وہ واقعی عظیم تھے۔ اور ان کی شخصیت کے ان دونوں پہلوؤں نے انھیں ان کے پڑھنے والوں اور ماننے والوں میں سیکڑوں برسوں سے ان کو بے حد عزیز بنا دیا۔

بابا فرید کے حالاتِ زندگی اور ان کی شاعری کے اس مختصر جائزے سے بابا فرید کی شخصیت کا تصور جو ہمارے سامنے ابھرتا ہے وہ آخر کیا ہے؟ وہ ہمیں ایک بزرگ، ایک لائقِ احترام پیر، اصولوں کے پابند لیکن نرم دل عالم، اور محبت کرنے والے استاد نظر آتے ہیں۔ وہ ایک دانشمند تھے جنھوں نے پوری دنیا چھاننے کے بعد یہ سمجھ لیا کہ دنیاوی زرق برق محض ایک دھوکا ہے۔ وہ ایک عبادت گزار، عقیدت مند درویش تھے جنھوں نے اپنی پوری زندگی وصول اللہ کے لیے وقف کر دی۔ ریاضت کی سختیوں سے وہ کبھی نہیں گھبرائے۔ وہ ایک عظیم اور اعلیٰ شاعر تھے جنھوں نے لافانی حسن والے الفاظ میں اپنے رب کے لیے اپنی آرزو اور تمنا کے گیت گائے۔

اور سب سے بڑھ کر آخری بات یہ کہ وہ ایسے شخص تھے جنھوں نے اللہ کی شیرینی کو چکھا اور اس کے ذائقے کو زریں الفاظ میں بیان کیا۔

مٹھائی میٹھی ہے اور شکر اور شہد
اور بھینس کا دودھ بھی میٹھا ہے

ہاں یہ سب چیزیں میٹھی ہیں
لیکن ان سے کہیں زیادہ میٹھی ہے
خدا کی ہستی ۔

تمام شد

شیخ فریدالدین گنج شکر (۱۲۶۵ — ۱۱۷۳) جنھیں عام طور پر بابا فرید کہا جاتا ہے، عالم اسلام کے سب سے بڑے صوفیوں میں سے ہونے کے علاوہ پنجابی زبان کے پہلے بڑے شاعر اور ہندو مسلم اتحاد کی مرکزی علامت بھی تھے۔ بابا فرید کو ہندو، مسلمان اور سکھ سب کے سب محبت اور احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ سکھ مذہب اور ثقافت پر ان کے اثر کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا بہت سارا کلام گورو گرنتھ صاحب میں شامل ہے۔ پروفیسر بلونت سنگھ آنند نے اپنی مختصر انگریزی کتاب میں تصوف کے بنیادی معاملات اور اسلامی فکر میں تصوف کی اہمیت کے حوالے سے حضرت بابا صاحب کی حیات اور ان کے کلام پر عالمانہ تبصرہ کیا ہے۔

اس کتاب کی مترجم مہرافشاں فاروقی نے ہندوستانی ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ پر الٰہ آباد یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا ہے۔ آج کل وہ خدابخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ میں سینیر ریسرچ فیلو کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔

پانچ روپے